ماہنامہ

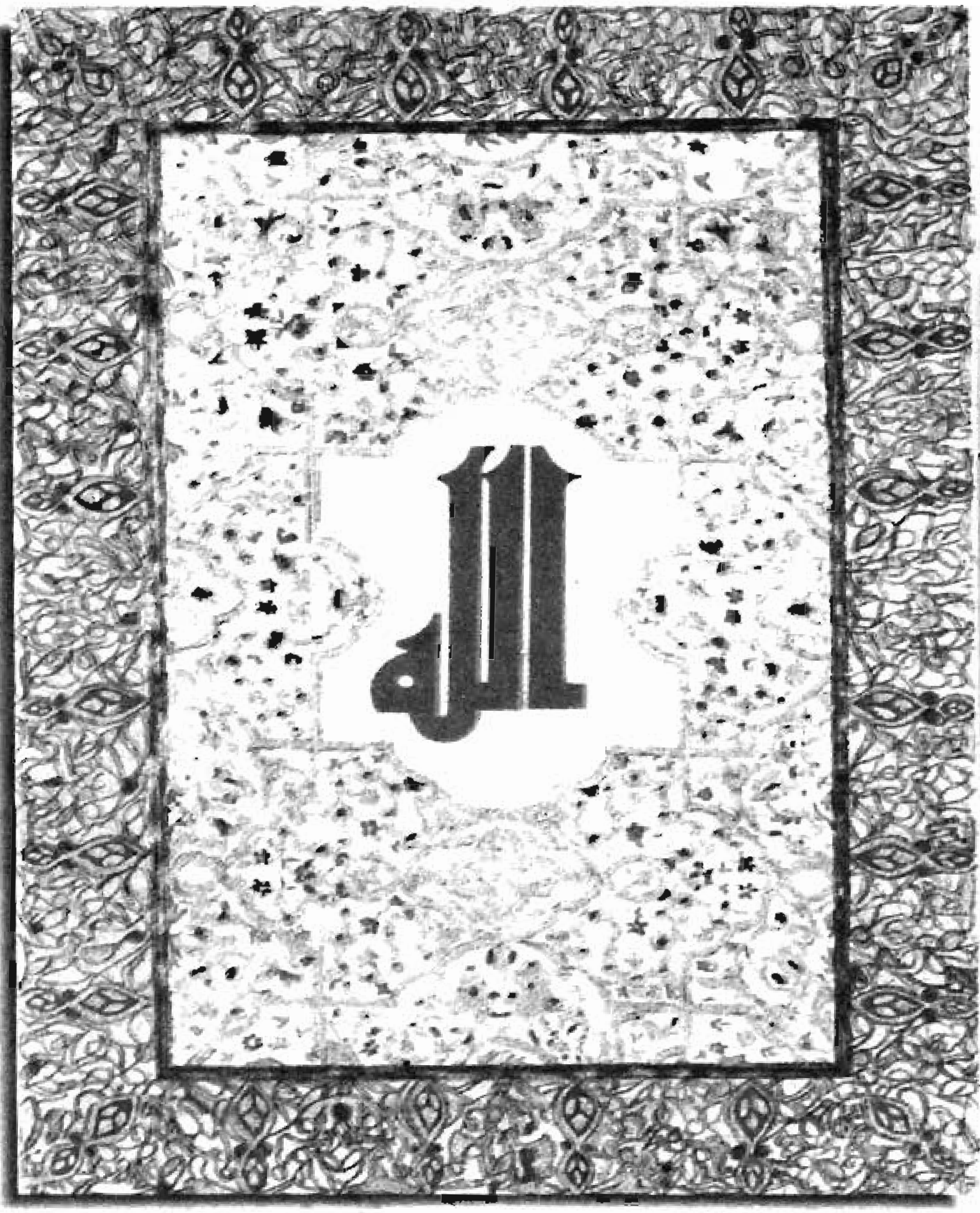
ترجمان القرآن

جاری کردہ

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

مدیر

خورشید احمد



ماہنامہ

ترجمان القرآن

مدیر: خورشید احمد　　　نائب مدیر: مسلم سجاد

جلد ۱۲۴　　　نومبر ۱۹۹۷ء، رجب ۱۴۱۸　　　عدد ۱۱

ترتیب

ادارتی امور

منصورہ، ملتان روڈ، لاہور ۵۴۵۷۰

فون: ۷۸۴۴۶۰۵

فیکس: ۷۸۳۲۱۹۴

انتظامی امور

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

فون: ۷۵۸۷۹۲۶ - ۷۵۸۵۵۹۰

☆

قیمت فی شمارہ ۱۵ روپے

زر سالانہ ۱۵۰ روپے

بھارت -/۳۰۰

بنگلہ دیش، ایران -/۴۵۰

مشرق وسطی، یورپ،

مشرق بعید، افریقہ -/۶۵۰

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا -/۹۰۰

بنک ڈرافٹ

بنام ماہنامہ ترجمان القرآن ارسال فرمائیں

اطلاع

سررشتہ تعلیمات سرکار آصفیہ کی جانب سے ہر سال ترجمان القرآن کے جو ڈھائی سو پرچے مدارس کے لیے خریدے جاتے تھے اُن کو ماہ شوال ۵۶ھ سے گھٹا کر (۱۱۸) کر دیا گیا ہے لہٰذا جن مدارس وسطانیہ و تحتانیہ کو آئندہ مہینہ سے پرچہ نہ پہنچے انھیں یاد دہانی کی زحمت نہ اٹھانی چاہیے۔

جو مدارس آئندہ اس رسالہ کی خریداری جاری رکھنا چاہیں وہ اپنے بجٹ سے پرچہ خرید سکتے ہیں۔

منیجر

اطلاع ثانی

ماہ ذی القعدہ ۵۶ھ میں رسالہ ترجمان القرآن کا دفتر حیدرآباد سے جمال پور ضلع گورداسپور (پنجاب) میں منتقل ہو جائے گا۔ صرف ماہ شوال کا پرچہ حیدرآباد سے شائع ہوگا۔ لہٰذا ممالک محروسہ سرکار نظام کے اضلاع میں جو اصحاب اس رسالہ کے خریدار ہیں وہ براہِ کرم دفتر کو مطلع فرما دیں کہ ان کا پرچہ کس مقام کے انگریزی ٹپہ خانہ کی معرفت بھیجا جائے۔

منیجر

(ترجمان القرآن، جلد ۱۱، عدد ۳، رمضان ۱۳۵۶ھ، نومبر ۱۹۳۷ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

اقبالؒ کا پیغام ـــــ امت مُسلمہ کے نام

قاضی حسین احمد

علامہ اقبالؒ نے "اسرار و رموز" کی آخری نظم: "عرض حال مصنف بحضور رحمتہ للعالمینؐ" میں یہ بیان کیا ہے کہ امت مسلمہ کی حیثیت ایک بے جان لاش کی سی ہو گئی ہے۔ یہ آپؐ کی تعلیمات اور آپؐ کی ذات کو بھول کر آپؐ سے ناآشنا ہو گئی ہے۔ اس کے تمام دکھوں کا مداوا کرنے کے لیے میں نے اس کو بھولا ہوا سبق یاد دلایا ہے۔ قرآن کریم کی تعلیمات سے اس کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی ہے اور آپؐ کے حضور میں اس کو پیش کیا ہے۔ حضورؐ سے عرض کرتے ہیں کہ پہلے بھی آپؐ ہی نے انسانیت کو ایک حیات بخش پیغام سے آشنا کیا۔ اب میں آپؐ ہی کے سامنے آپؐ کی امت کو لے کر آیا ہوں، آپؐ ہی اس امت کا علاج کر سکتے ہیں۔ اس نظم میں حضور نبی کریمؐ سے اقبال کا عشق و محبت کا تعلق، بالکل صاف جھلکتا ہے۔ فارسی کی اس نظم میں وہ کہتے ہیں کہ جب سے میں نے اپنی امی سے آپؐ کا نام سنا ہے اور آپؐ سے آشنا ہوا ہوں، آپؐ مجھے اپنے ماں باپ سے زیادہ عزیز ہو گئے ہیں۔ جب اس امت کے دل میں آپؐ کی محبت جاگزیں ہو گی اور آپؐ پھر سے اس امت کے محبوب بنیں گے تب ہی اس کے تمام دکھوں کا مداوا ہو سکے گا۔ اگر فارسی سمجھنے والے اس نظم "عرض حال مصنف بحضور رحمتہ للعالمینؐ" کا مطالعہ کریں تو انھیں اندازہ ہو گا کہ اقبال دلوں میں حضورؐ کی محبت پیدا کر کے ہمیں قرآن پاک کی تعلیمات سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے عام شعرا کی طرح شاعری شوقیہ نہیں اپنائی بلکہ شعر گوئی کو اپنے پیغام کا ذریعہ بنایا ہے۔ ایک فارسی شعر میں کہتے ہیں:۔

نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ ایست سوے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

کہاں شاعری اور کہاں میں، شاعری تو ایک بہانہ ہے۔ میرا اصل کام یہ ہے کہ جو ناقہ بے زمام (امت مسلمہ) ہے اس کو قطار کے اندر کسی نظم و ضبط کے تحت لے آؤں۔ چنانچہ اقبالؒ امت کو بتاتے ہیں کہ تیرا

اصل محبوب کون ہے۔ وہ امت کی تمام خرابیوں کا سبب یہی بیان کرتے ہیں کہ وہ اپنے محبوبؐ کو بھول گئی ہے۔ ایک رباعی میں فرماتے ہیں:۔

شبے پیش خدا بگریستم زار مسلماناں چرا زارند و خوارند
ندا آمد، نمی دانی کہ ایں قوم دلے دارند و محبوبے نہ دارند

کہ میں ایک رات زار و قطار اللہ کے حضور میں روتا رہا۔ میں نے کہا کہ یہ مسلمان کیوں ذلیل و خوار ہیں؟ ندا آئی کہ کیا تمھیں پتا نہیں کہ اس قوم کے سینے میں دل ہے لیکن اس میں محبوب نہیں ہے۔ چنانچہ اقبال کی پوری کوشش یہ ہے کہ وہ امت کو محبوب کی پہچان کرا دیں۔ اور دلوں میں نبیؐ کی محبت ڈالنے کے بعد وہ حضورؐ، ان کی سیرت و تعلیمات، شریعت اور قرآن کے ذریعے اصلاح کا کام کریں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

در دل مسلم مقام مصطفیٰؐ است آبروئے ما زنام مصطفیٰ است
در شبستان حرا خلوت گزید قوم و آئین و حکومت آفرید
از کلید دیں در دنیا کشاد ہم چو او بطن ام گیتی نزاد

مسلمان کے دل میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام ہے۔ ہماری آبرو ان کے نام کی وجہ سے ہے۔ انھوں نے حرا کی تاریکیوں میں خلوت اختیار کی تو قوم بنائی، حکومت بنائی اور آئین بنایا اور دین کی چابی سے دنیا کا دروازہ کھولا۔ یعنی دین اور دنیا کوئی الگ الگ چیزیں نہیں ہیں بلکہ دین، دنیا کا دروازہ کھولنے کا ذریعہ ہے۔ انھوں نے دنیا میں زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھایا کہ کس طریقے سے دنیا میں رہنا ہے اور بندوں کے کیا حقوق ہیں، اللہ کے کیا حقوق ہیں، آپس میں کس طریقے سے مل جل کر رہنا ہے اور گھر کے اندر کیسے رہنا ہے، معاملات کیسے طے کرنے ہیں۔ یہ دین کے تمام اصول اور طریقے دنیا میں جینے کا سلیقہ سکھانے کے لیے آئے ہیں۔

حضورؐ نے جو آئین دیا تھا اس کی تشریح اقبال کے کلام میں جگہ جگہ ملتی ہے۔ وہ آئین کیا تھا جو نبیؐ نے دیا تھا؟ وہ قوم کون سی تھی جس کو حضورؐ نے پیغام دیا اور جس کی تشکیل کی۔ اور اس حکومت کے کیا اصول تھے جو حضورؐ نے قائم فرمائی۔ اقبال نے اپنے کلام میں جگہ جگہ کہا ہے کہ قرآن کریم وہ آئین ہے جو حضورؐ نے اس امت مسلمہ کو دیا:۔

آں کتاب زندہ، قرآن حکیم حکمت او لا یزال است و قدیم

وہ زندہ کتاب قرآن کریم ہے۔ اس کی حکمت لازوال اور ہمیشہ سے ہے۔ قرآن کریم کی یہ شان ہے کہ جب ایک دور گزرتا ہے تو دوسرے دور کے لیے نئی آب و تاب کے ساتھ اپنی تعلیمات کو پیش کر دیتا ہے۔ اس کی تعلیمات کبھی پرانی نہیں ہوتیں۔ یہ آئین (قرآن مجید) زمان و مکان کی حدود میں محصور نہیں۔

"اسرار و رموز" میں اس پر باب باندھے گئے ہیں کہ اس امت کا نہ کوئی انتہائے زمانی ہے اور نہ کوئی انتہائے مکانی ہے۔ جو آئین اللہ تعالیٰ نے دیا ہے وہ زمان و مکان کی حدود سے بالاتر ہے۔ اقبال کی مشہور نظم ہے:۔

خودی کا سر نہاں لا الٰہ الا اللہ خودی ہے تیغ، فساں لا الٰہ الا اللہ
یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے صنم کدہ ہے جہاں، لا الٰہ الا اللہ
خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری نہ ہے زماں نہ مکاں، لا الٰہ الا اللہ
یہ نغمہ فصل گل و لالہ کا نہیں پابند بہار ہو کہ خزاں، لا الٰہ الا اللہ

یعنی کوئی زمان و مکاں کی حد نہیں ہے۔ جو بھی ملک ہو اور جو بھی زمانہ ہو، حضورؐ کی تعلیمات ہر ملک اور ہر زمانے کے لیے ہیں۔ یہ دین قید مکاں اور قید زماں سے آزاد ہے۔ اقبال حضورؐ کی ملت کے بارے میں کہتے ہیں:۔

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر خاص ہے ترکیب میں قوم رسولؐ ہاشمی

اقوام مغرب، وطن اور زبان و مکان کی بنیاد پر قومیت کی قائل ہیں، لیکن اقبال کہتا ہے کہ وطنی قومیت کو بت بنانا حضورؐ کی بنیادی تعلیمات کے خلاف ہے اور اسی طرح وطن پرستی کے بارے میں کہتے ہیں:۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے جو پیرہن اس کا ہے، وہ مذہب کا کفن ہے

وہ بتاتے ہیں کہ حضورؐ نے جو امت بنائی ہے وہ کس طرح زبان، مکان اور نسل اور علاقے کی حدود سے بالاتر ہے۔ فرماتے ہیں:۔

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیز رنگ و بو برما حرام است کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم

ہم نہ افغان ہیں، نہ ترک ہیں، نہ تاتار ہیں۔ مختلف اشعار میں کہتے ہیں کہ نہ حجازی نہ چینی، نہ ہندی بلکہ ہم تو حضورؐ کی ذات بابرکات کے گرد جمع ہونے والی ایک امت ہیں۔ ہماری اساس اور ہمارا بنیادی عقیدہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے، اسی کی بنیاد پر ہم ایک قوم ہیں اور عقیدۂ توحید کی اساس پر قائم ہیں۔ چنانچہ وہ "ترانہ ملی" تو سب کو یاد ہے:۔

چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

اور پھر مسلمانوں کی تاریخ یاد کرتے ہوئے اپنے مرکز اور عقیدے کی نشان دہی کرتے ہیں:۔

دنیا کے بت کدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا ہم اس کے پاسباں ہیں، وہ پاسباں ہمارا
توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

اس "ترانہ ملی" میں تاریخ بھی بیان کی ہے۔ اندلس کی زمین کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

اے گلستان اندلس! وہ دن ہیں یاد تجھ کو تھا تیری ڈالیوں میں جب آشیاں ہمارا

"ترانہ ملی" میں وہ اپنی ملت اور حضورؐ کی امت کی تعریف کرتے ہیں۔ اس کی تاریخ یاد کرتے ہیں اور اس حقیقت کو دہراتے ہیں کہ یہ امت، علاقے اور ملک کی حدود سے بالاتر ہے۔ توحید پر اس کی اساس ہے اور کعبہ اس کا مرکز و محور ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے قافلہ سالار ہیں (سالار کارواں ہے میر حجاز اپنا--- اس نام سے ہے باقی آرام جاں ہمارا)، جہاد فی سبیل اللہ اس کا طریق زندگی ہے (تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں --- خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا)۔ اندلس میں "طارق کی دعا" سے اقبال مسلمانوں کو یہ تعلیم دے رہے تھے اور ان کو یہ یاد دلا رہے تھے کہ پوری روے زمین ان کا ملک ہے کیوں کہ ان کے اللہ کی ملکیت ہے:۔

طارق چو برکنارۂ اندلس سفینہ سوخت گفتند کار تو بہ نگاہ خرد خطاست
دوریم از سواد وطن باز چوں رسیم؟ ترک سبب زروے شریعت کجا رواست
خندید و دست خویش بہ شمشیر برد و گفت ہر ملک ملک ماست کہ ملک خداے ماست

طارق جب اندلس کی سرزمین پر اترے تو انھوں نے کشتیاں جلا دیں کہ یہ خواہ مخواہ ایک سہارا ہے جس میں مجاہدین بیٹھ کر واپس جا سکتے ہیں، حالانکہ ان کا ملک تو یہ ہے، اسی میں اللہ کا پیغام پہنچانا ہے، اس میں توحید کی تعلیم دینی ہے۔ اس لیے اس سے رشتہ جوڑنے کے لیے واپسی کی کشتیوں کو جلا ڈالا۔ وہاں کے عقل مندوں نے کہا کہ عقل کے مطابق یہ کام صحیح نہیں ہے، شریعت کے تحت کہاں یہ جائز ہے کہ آپ واپسی کے سبب کو ختم کر دیں۔ طارق اپنی تلوار کی طرف ہاتھ بڑھا کر مسکراتے ہوئے کہتے ہیں: "ہر ملک ملک ماست کہ ملک خداے ماست"۔ یعنی ہر ملک ہماری اور ہمارے اللہ کی ملکیت ہے۔ یہ حضورؐ کی اس حدیث کی طرف بھی اشارہ ہے، جس میں انھوں نے کہا ہے کہ یہ پوری روے زمین میری مسجد ہے۔ اس کا بھی بہت دل نشیں انداز میں اقبال نے ذکر کیا ہے:۔

مومناں را گفت آں سلطان دیں مسجد من ایں ہمہ روے زمیں

کہ اس سلطان دین، محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مومنین سے کہا کہ ساری روے زمین میری مسجد ہے:۔

الاماں از گردش نہ آسماں مسجد مومن بدست دیگراں

میں نو آسمانوں کی گردش سے پناہ مانگتا ہوں کہ گردش لیل و نہار نے ہمیں یہ دن دکھایا کہ مومنین کی مسجد غیروں کے ہاتھ میں ہے:۔

سخت کوشد بندۂ پاکیزہ کیش، تا بگیرد مسجد مولاے خویش

پاکیزہ صفت مومن کا فرض ہے کہ انتہائی کوشش کرے کہ اپنے آقا و مولا صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد کو واگزار کرائے:۔

اے کہ از ترک جہاں گوئی مگو ترک ایں دیر کہن تسخیر او

اے وہ شخص جو کہتا ہے کہ ترک دنیا کرو، ایسا مت کہو کہ اس دنیا کو تسخیر کرنا ہی درحقیقت اس کا ترک کرنا ہے۔

یہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث مبارک کی طرف اشارہ ہے جس میں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت کی رہبانیت جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ رہبانیت اور جہاد فی سبیل اللہ میں ایک مشابہت ہے۔ اسی لیے رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ میری امت کی رہبانیت جہاد میں ہے۔ مشابہت یہ ہے کہ رہبانیت میں آدمی دنیا اور تعلقات کو چھوڑ کر جنگلوں کی طرف چلا جاتا ہے۔ مال و دولت، زر و زن اور وطن سب کچھ چھوڑ دیتا ہے۔ غرض دنیا ترک کر دیتا ہے اور حضورؐ نے کہا میری امت کی رہبانیت یہ نہیں ہے، جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ اس میں مومن دنیا کو ترک نہیں کرتا بلکہ دنیا کے سارے وسائل اور جتنی بھی قوت اس کے پاس ہے اس کو اللہ کے راستے میں قربان کرتا ہے۔ تمام تعلقات اور تمام توانائیاں اعلاے کلمتہ اللہ کے لیے صرف کر دیتا ہے۔ حضور نبی کریمؐ نے یہ راستہ بتایا کہ اس طریقے سے مومن اپنے آقا کی مسجد کو واپس حاصل کر سکتا ہے۔

جن غیروں کا ذکر اقبال نے ان اشعار میں کیا کہ انھوں نے اس دنیا میں غلبہ حاصل کر کے روے زمین کو اپنی آماجگاہ بنا لیا ہے۔ یہ غیر کون ہیں؟ ان کی نمایندہ مغربی تہذیب ہے۔ اقبال نے بتایا کہ یہ کچی بنیادوں پر کھڑی ہے۔ ۱۹۰۵ سے ۱۹۰۸ کے درمیان اقبال یورپ میں علم حاصل کر رہے تھے۔ ۱۹۰۷ میں انھوں نے یہ نظم لکھی تھی اور پیش گوئی کی تھی:۔

سنا دیا گوش منتظر کو حجاز کی خامشی نے آخر جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا تھا پھر استوار ہو گا
نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہو گا
تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپایدار ہو گا

۱۹۰۷ میں لکھی گئی یہ نظم بہت خوب صورت ہے اور اس کا ایک ایک شعر پڑھنے کے قابل ہے اور دلوں کو گرما دینے، جذبوں کو ابھارنے اور امید دلانے والا ہے۔ اس میں انھوں نے کہا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کی بنیادیں نہایت خام ہیں۔ ناپختہ بنیادوں کی وجہ سے یہ تہذیب منہدم ہونے والی ہے۔ ان بنیادوں پر کوئی عمارت ہمیشہ کے لیے کھڑی نہیں ہو سکتی۔ کیمونزم کے زوال کی بھی نشان دہی کی۔ "جاوید نامہ" میں ایک نظم "پیغام افغانی بہ ملت روسیا" لکھی ہے۔ اس میں انھوں نے بہت خوب صورت طریقے سے روس،

قوم کو پیغام دیا ہے کہ جب تک اللہ کے راستے پر نہیں چلو گے تم انسانیت کو کچھ نہیں دے سکتے ہو۔ اور چونکہ وہ اللہ کی طرف نہیں چلے اس لیے ان کی تہذیب کو زوال آیا۔ مغربی تہذیب کے بارے میں کہا کہ یہ مادہ پرستانہ تہذیب، انسانیت کی رہنمائی کے قابل نہیں ہے۔ جو نیو ورلڈ آرڈر کی باتیں کرتے ہیں ان کے پاس حقیقتاً کوئی نظام نہیں بلکہ فساد ہی فساد ہے۔ بنیاد پرستی کے خلاف جو طوفان اٹھایا ہے یہ بھی دراصل ان کے اپنے باطنی ضعف کا اظہار ہے۔ زمانہ تقاضا کر رہا ہے کہ کوئی نیا نظام آئے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں اسلام سے خوف آتا ہے۔ اپنی مشہور نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں انھوں نے اس کا ذکر کیا ہے اور ابلیس نے اپنے شاگردوں کو ان خطرات سے آگاہ کیا ہے، جو ابلیسی نظام کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ پہلے ابلیس اپنے شاگردوں سے استفسار کرتا ہے کہ اس کے نظام کے لیے موجودہ دور میں کون سے خطرات درپیش ہیں؟ کوئی اشتراکیت کو فتنہ بتاتا ہے اور کوئی کسی اور خطرے کی نشان دہی کرتا ہے لیکن آخر میں ابلیس خود کہتا ہے: نہیں، مجھے اصل خوف تو مسلمانوں سے ہے جو اپنے اشک سحرگاہی سے اب بھی وضو کرتے ہیں۔ ان خال خال لوگوں سے مجھے خطرۂ حقیقی ہے۔ اس کے ساتھ کہتا ہے:

جانتا ہوں میں یہ امت حامل قرآں نہیں ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں بے یدبیضا ہے پیران حرم کی آستیں
عصر حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف ہو نہ جائے آشکارا شرع پیغمبرؐ کہیں
الحذر آئین پیغمبرؐ سے سو بار الحذر حافظ ناموس زن، مرد آزما، مرد آفریں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب بادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

ابلیس بتاتا ہے کہ ابلیسی نظام کو زبردست خطرے کا سامنا ہے، اور وہ یہ کہ کہیں لوگوں پر شریعت محمدیؐ آشکارا نہ ہو جائے۔ اس وجہ سے نہیں کہ اس کے حاملین بڑے زبردست لوگ ہیں۔ وہ تو مجھے معلوم ہے کہ کس طرح کے لوگ ہیں لیکن چونکہ عہد حاضر کا تقاضا ہے اس لیے مجھے خوف ہے کہ لوگوں پر پیغمبرؐ اسلام کی شریعت عیاں ہو جائے گی۔ جب عیاں ہو جائے گی تو اس کی کشش اتنی زبردست ہے کہ وہ میرے ابلیسی نظام کے لیے خطرہ ہو جائے گی۔ اس کی مختلف صفات بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: ؏

الحذر، آئین پیغمبر سے سو بار الحذر

شیطان آئین پیغمبر سے پناہ مانگتا ہے کیونکہ وہ ناموس زن کا محافظ ہے۔ وہ عورت کو عورت سمجھتے ہوئے اس کو احترام عطا کرتا ہے، نازن بنانے پر اس کو مجبور نہیں کرتا۔ مرد کو مرد کے مقام پر اور عورت کو عورت کے مقام پر عزت دیتا ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے کا مونس و غم خوار بناتا ہے۔ اور معاشرے کو مل جل کر

ایک دوسرے کے لیے مدد کرنے کا درس دیتا ہے:۔

الحذر، آئین پیغمبر سے سو بار الحذر حافظ ناموس زن، مرد آزما، مرد آفریں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں

دولت کو سود، جوا اور دوسرے خراب اور حرام طریقوں سے پاک صاف کرتا ہے۔ جس کے پاس حلال کی دولت آ جائے اس کو بھی کہتا ہے کہ تم امین ہو، مالک نہیں ہو۔ (منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امین)۔ مال کمانے اور خرچ کرنے کے حلال طریقے سمجھاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ ساری روے زمین اللہ کی ملکیت ہے۔ بادشاہوں کی ملکیت نہیں ہے۔ اشتراکیت کے بارے میں جو اقبالؒ نے ابتدائی پیغام دیا تھا اس میں ایک ایک شعر بڑا خوب صورت ہے:۔

دین آں پیغمبر حق ناشناس بر مساوات شکم دارد اساس

کہ وہ جو حق ناشناس پیغمبر ہے (یعنی کارل مارکس)، اس کے دین (یعنی کمیونزم) کا انحصار پیٹ کی مساوات پر ہے۔ اس کی خرابی اب تو ساری دنیا پر عیاں ہو گئی ہے، لیکن اقبالؒ نے اسی زمانے میں واضح کر دیا تھا کہ مغربی تہذیب بھی اسی طریقے سے ختم ہو جائے گی۔ کمیونزم ختم ہو گیا، مغربی تہذیب بھی ختم ہو جائے گی۔ اس کی جگہ کون سنبھالے گا؟ جگہ سنبھالنے کے لیے ایک تازہ دم امت کی ضرورت ہے، جو جذبہ جہاد اور اخلاق و کردار کے زیور سے آراستہ ہو اور قوت عمل سے سرشار ہو۔ اس لیے اقبال کہتے ہیں کہ امت کے لوگوں کو سخت کوشی کا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔

اقبال کا حضورؐ کے ساتھ خود بڑا گہرا تعلق تھا۔ وہ اس حوالے سے بھی جذبہ بیدار کرتے تھے۔ جنگ طرابلس پر نظم میں اس کا ذکر آیا ہے۔ عالم خیال میں وہ حضورؐ کی بارگاہ میں پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں حضورؐ ان سے پوچھتے ہیں کہ امت کا حال کیا تھا؟ میرے لیے کیا تحفہ لائے ہو؟ تو وہ امت کا حال بتاتے ہیں:۔

گراں جو مجھ پہ یہ ہنگامہ زمانہ ہوا جہاں سے باندھ کے رخت سفر روانہ ہوا
فرشتے بزم رسالت میں لے گئے مجھ کو حضور آیہ رحمت میں لے گئے مجھ کو
کہا: حضورؐ نے اے عندلیب باغ حجاز کلی کلی ہے تری گرمی نوا سے گداز
نکل کے باغ جہاں سے برنگ بو آیا ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تو آیا؟

تو اقبال کہتے ہیں کہ:۔

حضورؐ دہر میں آسودگی نہیں ملتی تلاش جس کی ہے، وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاض ہستی میں وفا کی جس میں ہو بو، وہ کلی نہیں ملتی

لیکن بعد میں امید اور روشنی کی جھلک دکھاتے ہیں ایک تحفہ پیش کرتے ہیں:۔

مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں | جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں | طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

اقبال کو شہدا کے خون میں ایک امید نظر آتی ہے۔ یہ ایسی قیمتی چیز ہے جس سے پھر ایک نئی صبح کے بیدار ہونے کا امکان ہے:۔

طرابلس کی جنگ ہی میں "فاطمہ بنت عبداللہ" ایک عرب لڑکی پانی پلاتے ہوئے شہید ہو گئی تھی۔ اس میں انھیں امید کی کرن نظر آئی تو اسے عام کرنے کی کوشش کی۔ وہ فاطمہ بنت عبداللہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

یہ سعادت حور صحرائی تری قسمت میں تھی | غازیان دیں کی سقائی تری قسمت میں تھی

اس کی تعریف کرنے کے بعد اس کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

فاطمہ گو شبنم افشاں آنکھ تیرے غم میں ہے | نغمہ عشرت بھی اپنے نالہ ماتم میں ہے

اگرچہ تیری شہادت کی وجہ سے ہم بہت غمگین ہیں لیکن اس غم میں خوشی کا ایک پہلو بھی چھپا ہوا ہے، اور خوشی کا پہلو یہ ہے کہ:۔

یہ کلی بھی اس گلستان خزاں منظر میں تھی | ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی

یہ چنگاری اقبال کو نظر آتی ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ اس کی خوشبو سارے عالم میں پھیل جائے گی اور ایک نئی صبح نمودار ہو گی۔ ایک نیا ولولہ پیدا ہو گا، بیداری پیدا ہو گی، اور قافلہ پھر سے اپنے سفر پر گامزن ہو جائے گا۔

ایک نظم "امامت" میں اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ امت محمدیہ کا حقیقی قائد کون بن سکتا ہے۔ قوم کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

تو نے پوچھی ہے امامت کی حقیقت مجھ سے | حق تجھے میری طرح صاحب اسرار کرے
ہے وہی تیرے زمانے کا امام برحق | جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
موت کے آئینے میں تجھ کو دکھا کر رخ دوست | زندگی تیرے لیے اور بھی دشوار کرے
دے کے احساس زیاں تیرا لہو گرما دے | فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے

وہ یہاں احساس زیاں کو زندہ کرنے کی بات کرتے ہیں۔ احساس زیاں کو زندہ کرنا اقبال کی شاعری اور ان کے پیغام کا اہم حصہ ہے۔ وہ احساس زیاں کے فقدان پر افسوس بھی کرتے ہیں:۔

وائے ناکامی! متاع کارواں جاتا رہا | کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

ان کو یہ افسوس ہے کہ ایک تو کارواں کا سارا سامان لٹ گیا اور ان کو پتا بھی نہیں کہ ان کا سارا سامان

لٹ گیا ہے۔ اس پر انھوں نے رونا رویا ہے اور امت کے جوانوں کے لیے ایک پوری نظم لکھی ہے۔ انھیں کہتے ہیں کہ حکومت کا تو کیا غم کہ وہ اک عارضی شے تھی یعنی حکومت تو زمانے کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ وتلک الایام نداولھا بین الناس قرآن مجید نے بھی ہمت بندھائی ہے کہ آج اگر شکست ہو گئی تو کل فتح بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن اقبال کو افسوس اور غم اس پر ہوتا ہے کہ:۔

مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا

ہمارے آباو اجداد کی کتابیں لوٹ کر لے گئے ہیں اور اپنے کتب خانوں میں ان کو سجالیا ہے، ان کی آنکھیں اس سے روشن ہوتی ہیں اور ہماری آنکھوں کا نور ہم سے چھن گیا ہے۔ اس احساس زیاں کی جانب وہ اپنی قوم کو ہر موقع پر متوجہ کرتے ہیں۔ چنانچہ جب یورپ سے واپسی پر سمندر کے سفر کے دوران صقلیہ (سسلی) نامی جزیرے پر، جہاں مسلمانوں کی ۲۰۰ سال حکومت رہی، نظر پڑی تو بے اختیار کہتے ہیں:۔

رولے اب دل کھول کر اے دیدۂ خونتابہ بار وہ نظر آتا ہے تہذیب حجازی کا مزار

اسی طرح اندلس میں دریائے وادی الکبیر کے کنارے پر واقع مسجد قرطبہ کو دیکھ کر، اپنے جذبات کا یوں اظہار کرتے ہیں:۔

آب روان کبیر، تیرے کنارے کوئی دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب

کون سی وادی میں ہے کون سی منزل میں ہے عشق بلاخیز کا قافلہ سخت جاں

ان کو نظر آ رہا ہے کہ عشق بلاخیز کا قافلہ سخت جاں ختم نہیں ہو سکتا۔ امت مسلمہ کے پاس جو پیغام، نور اور ہدایت ہے، امت کا ایمان ہے کہ اس کے بغیر انسانیت فلاح نہیں پا سکتی ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ امت یا پیغام یا توحید کی امانت ختم ہو جائے۔ یعنی ان کو انتظار ہے کہ وہ قافلہ سخت جاں کسی وادی میں سے گزر رہا ہو گا۔ کہیں سے آ رہا ہو گا، اور کہیں سے نظر آ جائے گا۔ اقبالؒ کو گرد اڑتی ہوئی نظر آ رہی ہے اور اس گرد میں سے ان کو کسی سوار کا انتظار ہے: ع

خرم آں کس کہ دریں گرد سوارے بیند

وہ کتنا خوش قسمت ہے کہ اس کو اس گرد سے نکلتا ہوا کوئی سوار نظر آ جائے۔ وہ اس انتظار میں محو ہیں لیکن ساتھ ساتھ احساس زیاں کو بیدار کر رہے ہیں۔

یہ وہ دور تھا جب ساری دنیا میں استعمار نے مسلمانوں کو غلام بنالیا تھا۔ اب تو آپ کے ۵۲، ۵۳ ممالک آزادی کی فضا میں جی رہے ہیں۔ ایک امید ہے، آگے بڑھ رہے ہیں۔ اس زمانے میں تو کچھ بھی نہیں تھا۔ مرد بیمار خلافت عثمانیہ دم توڑ چکی تھی، لیکن اقبالؒ نے امید کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا، احساس زیاں بیدار کر کے پھر امید دلائی، انھوں نے یاس و حزن کے بجائے امید کا درس دیا اور ناامیدی کو تمام امراض کی

جڑ قرار دیا۔ "اسرار و رموز" میں ایک باب اس پر باندھا ہے کہ یاس اور حزن ام الخبائث ہیں۔ ناامیدی تمام گندگیوں اور تمام امراض کی جڑ ہے۔ ناامید ہونے کے بعد انسان کے لیے اٹھنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ اٹھنے کے لیے تو امید ضروری ہے اور یاس و حزن سے تو اللہ کے نبیؐ نے پناہ مانگی ہے اور ناامیدی سے اللہ نے روکا ہے اور کہا ہے کہ: لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ۔

اقبالؒ نے طویل نظمیں لکھی ہیں کہ لوگ ناامید اور غمگین نہ ہوں۔ وہ یاس و حزن میں مبتلا نہ ہوں بلکہ کمر ہمت باندھ لیں، اور ان کو کمر ہمت باندھنے کے لیے انھوں نے امید کی جھلک دکھائی ہے اور مختلف واقعات کے ذریعے سے ان کے شوق کو بیدار کیا ہے۔ یہ ان کا بنیادی پیغام ہے کہ محبت اور شوق ہی بہت بڑے بڑے کام کرواتے ہیں:۔

دے ولولۂ شوق جسے لذت پرواز کر سکتا ہے وہ ذرہ مہ و مہر کو تاراج

کہ ولولہ شوق اور محبت کے نتیجے میں بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیے جاتے ہیں۔ شوق اور محبت کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا۔

"اسرار و رموز" میں انھوں نے خودی کی تعریف کی ہے کہ میں کیا ہوں۔ اپنی شناخت کو جانو۔ اگر ایک انسان اپنے آپ کو پہچان لے، اپنے رب کو پہچان لے اور اپنے مقام کو پہچان لے، تو اس کے بعد اللہ کی طاقت و نصرت اس کے شامل حال ہو جاتی ہے۔ اس لیے ان کی ساری کوشش یہ ہے کہ ایک مسلمان کو اس کے مقام اور حیثیت کی پہچان کرا دیں۔ موت کا فلسفہ بیان کرتے ہیں کہ موت کیا ہے:۔

خودی ہے زندہ تو ہے موت اک مقام حیات کہ عشق موت سے کرتا ہے امتحان ثبات

موت بھی زندگی کے سفر کا ایک مقام ہے۔ دنیا کی موت آخری منزل نہیں ہے۔ حیات اس کے بعد بھی جاری ہے۔ دنیا کا افق اس کو ختم نہیں کرتا۔ حیات کا تسلسل موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ اس پر مومن یقین رکھتا ہے اور اقبال کو اس پر یقین ہے۔

انھوںؒ نے قیادت کی ایک تعریف یہ بیان کی ہے کہ وہ تمھارا احساس زیاں بیدار کر دے اور دوسری یہ کہ تمھیں موت کے آئینے میں محبوب کا چہرہ دکھا دے اور تمھارا اس بات پر یقین ہو جائے کہ موت کی وادی میں سے گزریں گے تو محبوب سے ملاقات ہوگی اور موت کو تمھارے لیے وہ آسان بنا دے۔

وہ چاہتے تھے کہ لوگ اپنے محبوب کو پہچان لیں اور پھر اس کے لیے جدوجہد شروع کر دیں، اس کے لیے انھوں نے محنت اور جدوجہد پر بہت زور دیا ہے۔ اس حوالے سے اقبالؒ کی ایک مشہور نظم ہے جس میں ایک عقاب (بوڑھا عقاب) اپنے جوان بچے (شاہین) کو نصیحت کرتا ہے:۔

بچہ شاہیں سے کہتا تھا عقاب سالخورد اے ترے شہپر پہ آساں رفعت چرخ بریں
ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں
جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

کہتا ہے کہ تمھارے بازو بڑے قوی ہیں اور یہ جو رفعت چرخ بریں (آسمانوں کی بلندیاں) ہیں یہ تمھارے شہپر کے لیے بہت آسان ہیں۔ میں تمھیں بتاتا ہوں کہ جوانی کیا ہے۔ شباب کیا ہے۔ اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام جوانی ہے۔ جتنا زیادہ لہو جلے گا اتنی ہی زیادہ توانائی پیدا ہو گی۔ زندگی کا لطف وہی اٹھاتے ہیں جو سخت کوش ہوتے ہیں اور محنت و جدوجہد کرتے ہیں۔ وہی جوانی کی اصل لذتوں سے آگاہ ہوتے ہیں۔

اسی لیے تو شاہین دوسرے کا شکار نہیں کھاتا۔ اس کو کتنا ہی اچھا کھانا ملے گا لیکن وہ اپنے کیے ہوئے شکار کو ہی کھاتا ہے' کیونکہ جھپٹنے' پلٹنے اور محنت میں مزہ ہے:؎

جھپٹنا' پلٹنا' پلٹ کر جھپٹنا لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

اس سے لطف آتا ہے اور لہو گرم ہوتا ہے۔ محنت اور مسلسل محنت۔ اس کے لیے موج کی مثال دیتے ہیں:؎

موج ز خود رفتہ تیز خرامید و گفت ہستم اگر می روم' گر نہ روم نیستم

موج نے تیزی سے چلتے ہوئے کہا کہ چلتی رہوں تو میں موجود ہوں۔ چلنا چھوڑ دوں گی تو میرا وجود ختم ہو جائے گا۔ تحریک اس وقت تک زندہ رہتی ہے جب تک اس میں مسلسل حرکت ہے' تگ و دو ہے' حرکت کے نتیجے میں زندگی ہے۔ جہاں حرکت رک گئی تو اسی وقت عدم آگیا اور موت آگئی۔ اس لیے اقبال مسلسل حرکت کے قائل ہیں: ع

جوے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی

کہ ایک بہت بھاری پتھر ہے اور ایک شخص اس پتھر پر مسلسل تیشہ چلا کر محنت کر رہا ہے۔ اور اس محنت کے نتیجے میں اس پتھر سے دودھ کا چشمہ جاری ہے۔ یہی اس زندگی کا اصل لطف ہے۔ مسلسل محنت' جدوجہد' محنت' جہاد۔

یا وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات

یعنی مجاہد گنبد افلاک میں مسلسل اللہ کی بڑائی کا اعلان کرتا ہے۔ اقبال کے پیغام کے بنیادی نکات ہیں: عشق' شوق' جہد مسلسل اور محنت۔ اور یہ سب کس لیے؟ تاکہ اللہ کا دین سربلند ہو' اللہ کا کلمہ سربلند ہو۔ اس کے لیے اقبال جوانوں سے بڑی امیدیں باندھتے ہیں اور جوانوں کو الگ سے پیغام دیتے ہیں۔ وہ خواتین کو

بھی خصوصی پیغام دیتے ہیں اور خواتین کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ امت اُمومت سے ماخوذ ہے اور اُمومت، ماؤں اور خواتین کا احترام کرنا، یہی امت کی شیرازہ بندی ہے۔ خواتین اور بچیوں کو خصوصی طور پر مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

بہل اے دخترک این دلبری ہا مسلماں را نہ زیبد کافری ہا
منہ دل بر جمال غازہ پرورد بیاموز از نگہ غارت گری ہا

کہ اے میری بٹیا (چھوٹی بچی کو دخترک کہتے ہیں، یہ پیار کا لفظ ہے) سیرت و کردار سے فتح حاصل کرنا اور دلوں کو مسخر کرنا سیکھ لو۔ ناز و انداز، سنگھار اور میک اپ کے طریقے ترک کر دو۔ یہ جاہلیت کے طریقے مسلمانوں کو زیب نہیں دیتے۔

وہ خواتین کو خطاب کرتے ہوئے ان سے درخواست کرتے ہیں کہ ہماری جو یہ تاریک رات ہے اس سے سپیدۂ سحر نمودار کریں اور اس امت کے سامنے پھر سے قرآن کریم کی تلاوت کریں۔ کیا تجھے پتا نہیں ہے کہ یہ تیری قرات کا سوز تھا جس نے عمرؓ کی کایا پلٹ دی۔ جب انھوں نے اپنی بہن سے قرآن سن لیا تو وہاں سے ایمان لانے کی نیت سے حضورؐ کے دربار میں چلے گئے اور ان کی زندگی میں ایک انقلاب برپا ہو گیا۔ وہ واقعہ یاد کراتے ہوئے اقبال دختران اسلام سے کہتے ہیں:۔

زشام ما بروں آور سحر را بہ قرآں باز خواں اہل نظر را
تو می دانی کہ سوز قرات تو دگرگوں کرد تقدیر عمرؓ را

اس امت میں اصلاح کا کام امت کو حضورؐ سے آشنا کیے بغیر نہیں ہو سکتا۔ یہ اصلاح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کار کے مطابق ہی ہو سکتی ہے۔ مولانا مودودیؒ نے یہی طریق نبویؐ اختیار کیا۔ لوگوں کو اللہ کی طرف، توحید کی طرف دعوت دی جائے۔ جو قبول کر لیں، ان کو منظم کر کے ان کا تزکیہ کیا جائے اور جو بھی منظم جماعت بنے، اس میں سمع و طاعت اور مشاورت کے اصول اپنائے جائیں۔ اس منظم جماعت کو اصلاح معاشرہ اور اصلاح حکومت کے کام میں لگا دیا جائے۔ اقبالؒ نے یہی پیغام قرآن اور سیرت النبیؐ سے سیکھا اور اپنے کلام میں توحید اور رسولؐ کے ساتھ تعلق کی دعوت دی، شہادت کا شوق دلایا، جہد مسلسل کی تعلیم دی، محبت و عشق کا درس دیا۔ یہ خاص ان کا امتیاز ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ عقل و خرد سے زیادہ عشق، محبت اور شوق کارگر ہوتا ہے:۔

عطا اسلاف کا جذب دروں کر شریک زمرۂ لا یحزنون کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا ہوں مرے مولاؐ مجھے صاحب جنوں کر

وہ یہ چاہتے ہیں کہ اس کے ساتھ اللہ کے محبت اور اس کی نعمتوں کا شوق ہو جائے۔ وہ غازیوں کا نقشہ

پیش کرتے ہیں کہ:۔

یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے جنھیں تو نے بخشا ہے ذوق خدائی
دونیم، ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
دوعالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو عجب چیز ہے لذت آشنائی
شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن نہ مال غنیمت، نہ کشور کشائی

اللہ سے جڑ جانے کو لذت آشنائی کہتے ہیں۔ انسان اپنی حقیقت کو پہچان لیتا ہے۔ دونوں عالم سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ پھر صرف اللہ کی رضا ہی اس کو مطلوب ہوتی ہے اور اللہ کے راستے میں وہ اپنے آپ کو اور ہر چیز کو قربان کرنا چاہتا ہے۔ شہادت مطلوب و مقصود اس لیے بن جاتی ہے کہ وہ اپنے رب سے آشنا ہو گیا ہے۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ میری ساری چیزیں چلی جائیں لیکن میرا رب مجھ سے راضی ہو جائے۔ وہ ہر چیز سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ دنیا کی نعمتوں سے اس کو کوئی سروکار نہیں ہوتا، اور شہادت ہی اس کا مطلوب و مقصود بن جاتا ہے۔ یہی تحریک اسلامی کو مطلوب ہے۔ تحریک اسلامی، چاہے جماعت اسلامی ہو جس کی بنیاد مولانا مودودیؒ نے رکھی، چاہے اخوان المسلمون ہو جس کی بنیاد حسن البنا شہیدؒ نے رکھی، چاہے کسی اور خطے میں کوئی اور تحریک اسلامی ہو، چاہے اقبال نے یہ پیغام دیا ہو یا کسی اور مصلح نے۔ اس کا منبع صرف قرآن و سنت ہے۔ کسی کی اپنی کوئی فکر نہیں ہے اور نہ ہی کسی کی فکر کی کوئی وقعت ہے۔ امت مسلمہ صرف اور صرف حضورؐ کے گرد اکٹھی ہو سکتی ہے، کسی اور شخصیت کے گرد اکٹھی نہیں ہو سکتی ہے۔ صرف قرآن و سنت کے گرد اکٹھی ہو سکتی ہے۔ اسی لیے اقبالؒ نے اپنے ترانے میں کہا:۔

سالار کارواں ہے میر حجاز اپنا اس نام سے ہے باقی آرام جاں ہمارا

میر حجازؐ سالار کارواں ہیں اور صرف ان کے گرد یہ پوری امت اکٹھی ہو سکتی ہے، وہی فکر مطلوب و مقصود ہے جس کا منبع قرآن و سنت ہے۔ امت نے صرف اسی کو قبول کیا ہے۔ جہاں اس فکر میں اور کسی عالم دین یا لیڈر کی فکر میں کوئی فرق ہے تو امت مسلمہ نے بحیثیت مجموعی قرآن و سنت کے مقابلے میں کسی دوسری فکر کو کبھی درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ اقبال کی فکر صرف اس لیے محبوب ہے کہ اس نے پیغام خدا دیا ہے۔ "اسرار و رموز" کے آخر میں وہ بہت ہی پرجوش اور دعائیہ الفاظ میں حضور رحمت للعالمینؐ کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

گر دلم آئینہ بے جوہر است ور بحر فم غیر قرآن مضمر است
روز محشر خوار و رسوا کن مرا بے نصیب از بوسہ پاکن مرا

اگر میں نے قرآن اور حق کی پیروی کے علاوہ کوئی اور راستہ دکھایا ہے تو مجھے ذلیل و خوار کر دے اور

اپنے بوسہ پا سے محروم کر دے۔ ان کے دل میں اس سے زیادہ کوئی اور بددعا ہو نہیں سکتی تھی لیکن ساتھ ہی کہتے ہیں کہ:۔

گر در اسرار قرآن سفتہ ام   با مسلماناں اگر حق گفتہ ام
عرض کن پیش خدائے عزوجل   عشق من گردد ہم آغوش عمل

میں نے قرآن کا سبق دیا ہے اور اس کے اسرار بیان کیے ہیں۔ مسلمانوں کو اسی طرف بلایا ہے اور مسلمانوں کے سامنے حق کی تعلیم رکھی ہے۔ پھر حضور اکرمؐ سے کہتے ہیں کہ میرے حق میں اللہ سے دعا کریں کہ میرا شعر عمل صالح سے ہم آغوش ہو جائے۔ جس طرح ہر مصلح نے اس امت کو اللہ کی طرف بلایا ہے اسی طرح اقبالؒ نے بھی اللہ کی طرف بلایا ہے یہ پیغام امت مسلمہ کے لیے حیات بخش پیغام ہے' زندگی کا پیغام ہے اور بہت دل نشیں پیغام ہے۔ انھوں نے فارسی زبان کے ذریعے اپنے پیغام کو زیادہ وسیع حلقے تک پہنچایا ہے۔ اس کے نتیجے میں اس وقت وسط ایشیا' افغانستان اور ایران میں ان کا پیغام مقبول ہے۔ ایران کے انقلاب میں تو اقبال کا کلام مرکزی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ علی شریعتی نے اقبال پر ایک کتاب لکھی ہے: "ما و اقبال"۔ خامنہ ای جو اس وقت ایرانی قوم کے رہبر ہیں ان کی بھی اقبال پر ایک عمدہ تقریر ہے: "اقبال ستارہ بلند شرق"۔ تاجکستان میں جس وقت جہاد کی تحریک شروع ہوئی' اقبال کی وہ نظم جہادی ترانے کی شکل اختیار کر گئی تھی جس میں اقبال نے امت مسلمہ کو گہری نیند سے اٹھنے کی صدا دی ہے جس کا عنوان ہے: "از خواب گراں خیز"۔

از ہند و سمرقند و عراق و ہمداں خیز   از خواب گراں' خواب گراں خواب گراں خیز
فریاد ز افرنگ و دل آویزی افرنگ   فریاد ز شیرینی و پرویزی افرنگ
عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزی افرنگ   معمار حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز
از خواب گراں خواب گراں خواب گراں خیز
از خواب گراں خیز!

حقیقت یہ ہے کہ پاکستان اور بھارت کے مسلمان اردو داں طبقہ کے پاس ایک بہت بڑی نعمت اور حیات بخش پیغام ہے اور مسلمان نوجوانوں کا فرض ہے کہ اسے اپنے قلوب و اذہان کو گرمانے کے لیے استعمال کریں۔ اقبال نے خود کہا ہے:۔

اقبال کا ترانہ بانگ درا ہے گویا   ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

اقبالؒ نے ملت اسلامیہ کو دوبارہ سرگرم ہونے کے لیے آواز دی ہے۔ اس کے نتیجے میں قافلہ چل پڑا ہے۔ اقبال کا کلام قافلے کے لیے بانگ درا ہے۔

اس وقت جو لوگ عالم اسلام میں حکومت کر رہے ہیں وہ ہماری آرزوؤں کے آئینہ دار نہیں۔ ہمارا پہلا چیلنج یہ ہے کہ اپنی قیادت، صاف ستھری قیادت ہو، جو ہماری تمناؤں کے مطابق ہو، اور ہماری آرزوؤں کو پورا کرنے والی قیادت ہو، ہم ایک مخلص قیادت کے ذریعے سے ہم اپنی صفوں کو درست کریں۔ مغربی اور اسلامی تہذیب میں اس وقت جو معرکہ آرائی ہے، اس میں ہمارے لیے سب سے مشکل مرحلہ یہ ہے کہ ہمارے وسائل ہمارے ہاتھ میں نہیں ہیں۔ ہمارے وسائل پر دشمنوں کے آلہ کار لوگوں کا قبضہ ہے۔ ہم ان آلہ کاروں سے نجات حاصل کریں گے تو منزل تک پہنچ سکیں گے۔ ہم ایک مخلص قیادت کی رہنمائی کے ذریعے سے اس جنگ کو جیت سکتے ہیں اور یہ ہمارا حق بھی ہے کہ ہم انسانیت کی رہنمائی کریں۔ یہ اللہ کے آخری نبیؐ کا ہمارے نام پیغام ہے۔ نہ حضورؐ کے بعد کوئی نبی آئے گا، نہ اللہ کی کتاب کے بعد کوئی کتاب آئے گی اور نہ اس امت مسلمہ کے بعد کوئی اور قوم آنے والی ہے۔

پس خدا بر ما شریعت ختم کرد بر رسول ما رسالت ختم کرد
رونق از ما محفل ایام را او رسل را ختم و ما اقوام را

اقبالؒ نے کہا کہ ہم پر اللہ تعالیٰ نے امتوں کے سلسلے کو ختم کر دیا ہے۔ اور ہمارے رسولؐ پر رسولوں کے سلسلے کو ختم کر دیا ہے۔ ہمارے بعد کوئی اور قوم آنے والی نہیں ہے۔

حضورؐ نے فرمایا تھا کہ جب قیصر ہلاک ہو جائے گا اس کے بعد قیصر نہیں آئے گا جب کسریٰ ہلاک ہو جائے گا اس کے بعد کوئی کسریٰ نہیں آئے گا۔ اس کے بعد رسولؐ کی امت کی امامت ہو گی اور رہبری ہو گی۔ قیامت تک حق اس امت کے پاس ہے، اللہ کا آخری پیغام اس امت کے پاس ہے۔ توحید کی امانت ان کے سینوں میں ہے۔ اگر موجودہ مسلمان اپنے فرض کو پورا نہیں کریں گے اللہ کسی اور کو پیدا کر دے گا لیکن یہ حق ہے، اسی کو غالب ہونا ہے، اس کے لیے تیاری کی ضرورت ہے۔ اور اس کشمکش کا ابتدائی مرحلہ یہی ہے کہ ہم اس قیادت کو تبدیل کر دیں جو استعماری قوموں کی آلہ کار ہے اور جو مغربی تہذیب اور اسلامی تہذیب کی کشمکش میں ہمارے مقابلے میں دشمنوں کا ساتھ دے رہی ہے۔

کیا تیاری کی؟

صحاح اور سنن اور مسانید میں حد تواتر کو پہنچی ہوئی روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں کہیں تشریف لے جا رہے تھے۔

راستے میں ایک شخص نے دُور سے پکارا: یا محمدؐ!

آپؐ نے فرمایا: بولو کیا کہنا ہے

اس نے کہا: قیامت کب آئے گی؟

آپؐ نے جواب دیا: **وَیْحَکَ اِنَّھَا کَائِنَۃٌ لَا مَحَالَۃَ فَمَا اَعْدَدْتَ لَھَا؟** بندہ خدا، وہ تو بہرحال آنی ہی ہے۔ تو نے اس کے لئے کیا تیاری کی؟"

(تفہیم القرآن، جلد ۴ - ص ۳۴۹)

(بندہ خدا)

کیا خدا نہیں ہے؟

جوش ملیح آبادی نے اپنی ایک نظم میں خدا کے انکار کو موضوع بنایا۔ اس کا جواب سید علی اختر انصاری اکبر آبادی نے دیا۔ سید علی اختر کی اس نظم پر، جو ۳۰-۱۹۲۹ میں ایک کتابچے کی شکل میں مطبع عہد آفریں حیدر آباد دکن سے شائع ہوئی، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے **تقریب** کے عنوان سے مقدمہ لکھا۔ مولانا **الجمعیت** کی ادارت سے فارغ ہو کر نئے نئے حیدر آباد آئے تھے۔ چھوٹی تقطیع کے ۳۹ صفحات کے اس کتابچے میں مقدمہ ۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ تلاش بسیار کے بعد یہ کتابچہ حاصل ہوا ہے، ہم مولانا مرحوم کے نوادرات میں سے ایک کی حیثیت سے، **تقریب**، قارئین **ترجمان القرآن** کی نذر کر رہے ہیں۔ (مدیر)

اگر ہم کسی شخص سے کہیں کہ مکان بغیر معمار کے بن گیا، یا کرسی بڑھئی کی محنت کے بغیر خود بخود بن گئی، تو وہ اس بات پر بے اختیار ہنس دے گا اور یقین کرلے گا کہ کہنے والا یا تو مذاق کر رہا ہے یا اس کے دماغ میں کچھ فتور ہے۔ لیکن یہ عجیب ماجرا ہے کہ مکان اور کرسی جیسی حقیر چیزوں کے متعلق جس دعوے کو تمسخر یا حماقت سے تعبیر کیا جاتا ہے، وہی دعویٰ اتنے بڑے نظامِ کائنات کے متعلق کیا جا رہا ہے، ہنسی سے نہیں سنجیدگی کے ساتھ کیا جا رہا ہے، اور باوجود اس کے ان مدعیوں کے لیے پاگل خانوں کے دروازے بند ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ یہ سارا عالم کسی صانع کے بغیر بن گیا ہے، کسی خالق کے بغیر پیدا ہوا ہے، کسی مدبر کے بغیر چل رہا ہے، اس حکیمانہ نظام کو کسی حکیم نے قائم نہیں کیا۔ اس کی عظیم الشان قوتوں پر کوئی حکمراں نہیں ہے، اس کے لاکھوں کروڑوں، بلکہ درحقیقت بے شمار مدبرات امور کے عمل میں توافق، یکسانیت اور اشتراک عمل کسی ایک حاکم اعلیٰ کی حکومت کے بغیر پیدا ہو گیا ہے۔ اتنا بڑا احمقانہ دعویٰ دنیا کے سامنے علی الاعلان پیش کیا جاتا ہے اور ادعائے تعقل و تفلسف کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے مگر حیرت کا مقام ہے کہ دنیا اس پر حقارت کا قہقہہ لگانے کے بجائے اس کے ابطال کے لیے دلائل کی طالب ہوتی ہے، حالانکہ کائنات کا ایک ایک ذرہ اور خود مدعیوں کا وجود اس کا ابطال کر رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انسانی علم کی بنیاد حس پر ہے، اسی کے ذریعے وہ اشیا کا ادراک کرتا ہے، مگر اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ موجود صرف وہی چیز ہے جس

کو انسان براہ راست محسوس کرتا ہو۔ ہمارے محسوسات کا دائرہ نہایت محدود ہے۔ ہم چند میل سے زیادہ فاصلے کی چیز نہیں دیکھ سکتے، چند میل سے زیادہ دور کی آواز نہیں سن سکتے، چند گز سے زیادہ فاصلے کی بو نہیں سونگھ سکتے، اور جب تک کوئی چیز جسم سے بالکل لگ نہ جائے، نہ اس کو چھو سکتے ہیں، اور نہ چکھ سکتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اتنے محدود دائرے میں جو اشیا بلاواسطہ ہمیں محسوس ہوتی ہیں وہ بہت ہی تھوڑی ہیں، اور کوئی بے وقوف سے بے وقوف شخص بھی یہ اعتقاد نہیں رکھ سکتا کہ ان اشیا محسوسہ کے سوا دنیا میں کوئی شے موجود ہی نہیں ہے۔ ان محسوسات کے علاوہ دنیا کی بے شمار ایسی چیزیں ہیں جن کے وجود کا ہم یقین رکھتے ہیں اور اس یقین کے لیے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ وہ سب کی سب حس و مشاہدہ میں آ جائیں۔ خود محسوسات میں بے شمار ایسی چیزیں ہیں جن کا براہ راست احساس کیے بغیر ہم محض عقل سے ادراک کرتے ہیں۔ دیوار کے پیچھے سے آواز سن کر آواز دینے والے کے وجود کا ادراک، دھوئیں کو دیکھ کر آگ کے وجود کا ادراک، مکان کو دیکھ کر بانی مکان کے وجود کا ادراک اسی قبیل سے ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ مجرد حس پر بھروسہ کیا جائے تو ایک شے کے احساس سے دوسری شے کا احساس لازم نہیں آتا۔ پھر ان حواس کی فراہم کی ہوئی معلومات سے ہماری عقل بے شمار ایسی چیزوں کا ادراک کرتی ہے جو محسوس نہیں ہیں۔ کشش زمین کو کسی نے نہ دیکھا نہ سنا، نہ چکھا، نہ چھوا، نہ سونگھا۔ مگر زمین کی طرف اشیا کے انجذاب کو دیکھ کر عقل اس کے وجود کا ادراک کرتی ہے اور ہم اس پر یقین کر لیتے ہیں۔ زمین، آب و ہوا اور حرارت شمس کی نشوونما دینے والی قوتوں کو کسی نے حواس سے محسوس نہیں کیا مگر محسوسات میں اس کے مظاہر دیکھ کر عقل اس کے وجود کا یقین دلاتی ہے، اور ہم اس پر ایمان لے آتے ہیں۔ خود ہمارے بدن کی قوت مدبرہ جس کو طبیعت سے موسوم کیا جاتا ہے، ایک غیر محسوس شے ہے۔ مگر اس کے افعال و اثرات دیکھ کر عقل یہ نتیجہ نکالتی ہے کہ ایسی کوئی قوت ضرور موجود ہے، اور اس نتیجے سے ہم کبھی انکار نہیں کرتے۔ پس جب وہ بے شمار اشیا جو واقعی محسوسات سے ماورا غیر محسوسات، اور ان سے ماورا خالص معقولات پر مشتمل ہیں، غیر محسوس ہونے کے باوجود موجود ہیں، اور ان کے وجود سے انکار کی جرات نہیں کی جا سکتی تو سمجھ میں نہیں آتا کہ خدا کے معاملے میں احمق انسان کو اس قدر اصرار کیوں ہے کہ جب تک اسے حواس سے محسوس نہ کر لے گا، اس کے وجود پر ایمان نہ لائے گا۔

واقعہ یہ ہے کہ جہاں تک مجرد وجود باری تعالیٰ کا تعلق ہے، اس کے مظاہر اس قدر روشن، نمایاں اور بے حساب ہیں کہ عقل سلیم اس تک پہنچنے سے ہرگز عاجز نہیں ہے۔ مگر اصلی گمراہی کا سبب یہ ہے کہ انسان اسی عقل سے اس کی حقیقت اور حکمت کا راز معلوم کرنے کی کوشش شروع کر دیتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ غیر محدود ہستی اس کے محدود پیمانہ فکر و عقل میں سما جائے۔ لیکن جو عقل اس عزوجل کے بنائے ہوئے ایک

ذرے اور ایک پتے کی حقیقت کا بھی کلی ادراک نہیں کر سکتی' جو عقل اس ادنیٰ سے معمہ کو بھی سلجھا نہیں سکتی کہ ایک ماشہ بھر کے بیج سے کیونکر ایک تناور درخت پھوٹتا ہے اور اسی ایک مادہ سے لکڑی' چھال' پتے' رگیں' ریشے' پھل' پھول' رنگ' مختلف ذائقے اور مختلف رائحے پیدا ہو جاتے ہیں' وہ پوری کائنات کے بنانے والے کی حقیقت کو کیونکر سمجھ سکتی ہے' اور اس کے چھوٹے سے کوزے میں اس کی معرفت کاملہ کا بحر ناپیدا کنار کس طرح سما سکتا ہے۔ یہی مقام ہے جہاں پہنچ کر انسانی عقل حیران و سرگرداں ہو جاتی ہے اور یہیں سے جحود و انکار کا آغاز ہوتا ہے۔ لیکن اگر انسان عقل و دماغ سے اس گتھی کو سلجھانے کے بجائے اپنے دل کی آنکھیں کھولے اور وجدانی احساسات سے اس کو محسوس کرنے کی کوشش کرے تو یہ الجھن خود بخود رفع ہو جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ اسے اپنی روح کی قوتوں سے پرواز کر کے معرفت کی کسی خاص رفعت تک پہنچنے کا موقع بھی مل جائے' تاہم اگر ایسا نہ ہو تب بھی کم از کم اتنا ضرور ہو گا کہ اسے جستجو کی حیرانی سے نجات مل جائے گی' اور عقل صحیح کی روشنی میں وجود ذات کا جو علم اسے حاصل ہوا ہے' وہی ایمان کی صورت اختیار کر کے اس کے لیے باعث اطمینان و تسلی ہو جائے گا۔

یہی مضمون ہے جس کو اس نظم میں بیان کیا گیا ہے۔ اگر اس پر کوئی متکلم یا فلسفی کلام کرتا تو غالباً اس کو معقولات کے سارے آلات و اسلحہ اس میدان جنگ میں جمع کرنے پڑتے' وہ منطقی طرز استدلال سے مقدمات کو ترتیب دے کر صورت قیاس قائم کرتا' برہان' جدل' خطابت یا سفسطہ کی قسم میں سے کسی قسم کے مواد کو جمع کرتا۔ مخاطب کی حجتوں کو اپنے براہین کی پیہم ضربوں سے توڑتا۔ اولیات' فطریات' حدسیات' مشاہدات' تجربیات' متواترات' غرض تمام یقینیات کے انبار لگا دیتا۔ اور آخر میں کہتا کہ مدعا ثابت ہے کیونکہ اگر مدعا ثابت نہیں ہے تو نقیض مدعا ثابت ہو گا۔ لیکن نقیض مدعا کا اثبات محال کا اثبات ہے' اور محال کا اثبات ناممکن ہے۔ لہٰذا مدعا ہی ثابت ہے' ورنہ ارتفاع نقیضین لازم آئے گا۔ اس طرح ایک اچھی خاصی مجلس مناظرہ گرم ہو جاتی۔ لیکن ایک شاعر کا انداز بیان اور طرز استدلال منطقی سے مختلف ہوتا ہے۔ وہ دماغ کو خطاب نہیں کرتا' بلکہ دل کو خطاب کرتا ہے۔ وہ محال کے لازم آ جانے کا خوف دلا کر مقابل کو چپ کرنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ چند دل کو لگنے والی باتیں جمع کرتا ہے' چبھتے ہوئے انداز بیان میں انھیں پیش کرتا ہے اور شعر و نغمہ کے ذریعے نشاط پیدا کر کے سمع و قبول کے انھی دروازوں کو کھلوا لیتا ہے جو منطقی کے سامنے بند ہوتے ہیں' یا اگر کھلتے بھی ہیں تو دل کی جانب نہیں بلکہ دماغ کی طرف کھلتے ہیں۔ متکلم اپنی بحث کی ابتدا ایسے مقدمات سے کرتا جو حریف کے نزدیک بھی مسلم ہوتے ہیں مگر شاعر کو دیکھو کہ اس نے یہ راہ چھوڑ کر سب سے پہلے حریف کے سامنے صاف اقرار کیا ہے کہ اول اول میں خود بھی تمھارا ہم خیال تھا اور مجھ پر بھی وہی دور گزر چکا ہے جس میں تم اب مبتلا ہو۔ یہ اقرار پہلی نفسیاتی ضرب ہے جو ذہن سامع پر لگتی

ہے۔ اس کا قدرتی اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ شاعر کے کلام کو ایک واقف کار کے کلام کی طرح سنتا ہے اور خود بخود نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ جو شخص اس کوچے سے گزر چکا ہے، وہ اس کے نشیب و فراز اور پیچ و خم سے ضرور آگاہ ہو گا۔ اور جب اس نے اس مقام کی بود و باش ترک کی ہے تو ضرور کوئی کمزوری دیکھی ہو گی۔ شاعر اپنی اس ضرب کے قدرتی اثر کو محسوس کر لیتا ہے اور فوراً اس سے فائدہ اٹھا کر دل میں ایک چٹکی لیتا ہے تاکہ سننے والے کو ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو جائے کہ جب وہ الحاد و انکار کی حالت میں مبتلا تھا تو اس کی زندگی کس قدر تلخ تھی، چنانچہ کہتا ہے :۔

تمھیں خبر ہے کہ میں سمجھتا ہوں کیا ان اوقات زندگی کو
وہ خود پرستی کے تلخ لمحے کہ زہر ہیں نفس آدمی کو

وہ میرے دل کی تجلیوں کو غبار ظلمت بنا رہے تھے
وہ میرے اجزاے زندگانی پہ موت کی طرح چھا رہے تھے

چمن کے سینے میں گرچہ روح تبسم فصل گل رواں تھی
مگر مری شب پرستیوں پہ ضیاے حسن سحر گراں تھی

ہزار عرش اپنے بازوؤں پر اگرچہ فطرت اٹھا رہی تھی
تلاش ناکام مجھ کو لے کر عمیق غاروں میں جا رہی تھی

یہ حالت جس موثر اور پردرد انداز میں بیان کی گئی ہے اس کو سن کر اضطراری طور پر ایک منکر یہ سوچنے لگے گا کہ کہیں وہ خود بھی اس حالت میں مبتلا نہ ہو۔ اور جب وہ فی الواقع اپنے دیدۂ دل پر ایک پردہ سا پڑا ہوا محسوس کرے گا تو بے اختیار اس کا جی یہ چاہے گا کہ یہ پردہ کسی طرح اٹھے اور جن جلوؤں سے میری نگاہ محروم ہے، وہ کسی طرح سامنے آ جائیں۔ جب شاعر اس طریقے سے سامع کے دل میں راہ حق کی چٹک پیدا کر چکتا ہے تو اس کے بعد اصل موضوع کی طرف قدم بڑھاتا ہے اور قاعدے کے مطابق منکرین کے ان خیالات کو نقل کرتا ہے جن کی اسے تردید کرنی ہے مگر یہاں پھر اس کی راہ فلسفی و متکلم کی راہ سے الگ ہو جاتی ہے۔ متکلم اس موقع پر منکرین کے عقلی دلائل کو نقل کرتا کیونکہ اس کی رائے میں انکار کی بنا یہی دلائل ہیں اور ان کو توڑ دینے سے انکار رفع ہو جاتا ہے۔ مگر شاعر سرے سے عقلی دلائل کی طرف توجہ ہی نہیں کرتا۔ وہ اس کا قائل نہیں کہ ان کے انکار کے اصلی محرک یہ عقلی دلائل ہیں بلکہ اس کے نزدیک ذہن کی ایک الجھن نے ان لوگوں کو انکار پر آمادہ کیا ہے اور پھر عقل نے اس انکار کی تائید میں دلیلیں پیدا کر دی ہیں۔ اس لیے وہ مسبب کو چھوڑ کر خود سبب کی طرف بڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ محض تخلیق کا عقدہ لاینحل،

اور کارگاہ عالم کے گوناگوں کرشموں کا معما ہے جس کو حل کرنے کی فکر نے انسانی دماغ کو اپنے اندر الجھا رکھا ہے۔ یہ بے پایاں کائنات کہاں سے آئی اور کیونکر پیدا ہو گئی؟ کس طرح ان بے حساب جلووں اور رنگ برنگ کی صورتوں سے سج گئی؟ پھر اس میں یہ کون و فساد کا سلسلہ کیسا ہے؟ ہر آن ہماری عقل، توقعات اور خواہشات کے خلاف امور کیوں پیش آتے ہیں؟ بہار خزاں پر کیوں غالب آتی ہے؟ حق پر باطل کو کیوں فتح نصیب ہوتی ہے؟ خوبی کو برائی کے مقابلے میں، حسن کو قبح کے مقابلے میں، عیب کو صواب کے مقابلے میں کیوں کامیابی حاصل ہوتی ہے؟ یہ اور اس قسم کے بے شمار سوالات ذہن میں پیدا ہوتے ہیں، مگر ان کا کوئی معقول جواب نہیں ملتا۔ آخر انسان گھبرا کر کہہ اٹھتا ہے:

یہ ہر طرف ابتری ہے کیسی یہ محشر فتنہ ساز کیا ہے
خدا اگر ہے تو اس ہجوم ملال و عبرت کا راز کیا ہے

اس طرح مرض کی تشخیص کرنے کے بعد شاعر اس کے علاج کی طرف توجہ کرتا ہے، مگر یہاں بھی طرز استدلال متکلمانہ کے بجائے وہی شاعرانہ ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ تمھاری عقل، خدا تو درکنار، کائنات کے ایک ذرے کی حقیقت کو بھی سمجھنے سے قاصر ہے، پھر جب تم بے شمار موجودات عالم کی حقیقت کو نہ سمجھنے کے باوجود ان کے وجود سے انکار نہیں کرتے تو اسی نارسی عقل کی بنا پر وجود خدا کی تکذیب کیوں کرتے ہو؟ اس مضمون کو شاعر نے جس بلیغ انداز میں بیان کیا ہے، وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ کہتا ہے:

اگر یہ سچ ہے کہ عقل اب نارسی کی حد سے گزر چکی ہے
تمام وا ہو چکے ہیں عقدے کہ زلف دوراں سنور چکی ہے

کوئی بتائے کہ پختہ کاران عقل بھید ان کا پا سکے ہیں
نمو کے جو بے شمار چشمے زمین کی تہہ سے ابل رہے ہیں

کسی نے سمجھے ہیں راز اب تک چمن کی سرشار ہستیوں کے
کسی نے پائے ہیں بھید اب تک بہار کی مے پرستیوں کے

اس سلسلے کو پھیلا کر جب وہ عقل سے خود اس کی عاجزی کا اقرار کرا لیتا ہے تو زور کے ساتھ کہتا ہے:

کہ باہمہ عجز عقل پھر بھی کریں جو تکذیب ہم خدا کی
کمال دانشوری تو کیا ہے دلیل ہے جہل ناسزا کی

شاعر اس پر بس نہیں کرتا بلکہ اس گرم گرم چوٹ پر چابک دستی کے ساتھ ایک اور ضرب لگاتا ہے تاکہ عقل و خرد کے پندار میں جو کچھ جان باقی رہ گئی ہو، وہ بھی نکل جائے۔ کہتا ہے کہ علوم انسانی کے ہزارہا شعبے ہیں اور ان میں سے ایک ایک شعبے کا یہ حال ہے کہ لوگ اس کی تحقیق و تفتیش میں پوری پوری، عمریں

صرف کر دیتے ہیں تب جا کر کچھ نظر پیدا ہوتی ہے۔ آج دنیا میں کوئی بڑے سے بڑا عالم بھی ایسا نہیں ہے جو تمام علوم پر حاوی ہو اور جس کی عقل و فہم نے علم و حکمت کے تمام جزئیات و کلیات کا احاطہ کر لیا ہو۔ پھر جب تمہارے دماغ کی فضا اس قدر تنگ ہے تو کیونکر ممکن ہے کہ کائنات عالم کے تمام اسرار تمہاری سمجھ میں آ جائیں اور تمہاری محدود عقل، غیر محدود علم حقیقت کی حامل بن جائے۔ اس وسیع مضمون کو شاعر نے جس دل نشین پیرایہ میں بیان کیا ہے، اس کا لطف اٹھانے کے لیے پانچویں بند کو بغور پڑھو، اور دیکھو کہ شعر کی زبان نے ایک پوری کتاب کے مبحث کو کس طرح چند لفظوں میں ادا کیا ہے۔

اب یہ اعتراض باقی رہ جاتا ہے کہ دنیا میں بے شمار ایسے معاملات دن رات پیش آتے ہیں جو سراسر خلاف عدل و مصلحت معلوم ہوتے ہیں۔ اگر کوئی حکیم و دانا ہستی اس کارخانے پر حکمران ہوتی تو یہ بد نظمی ہرگز نہ ہوتی۔ شاعر اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ دنیا کے جو معاملات تمہاری عقل یا خواہشات کے خلاف ہیں ان کے متعلق یہ خیال کرنا کہ ان میں کوئی حکمت و مصلحت ہی نہیں ہے، ایک غیر معقول بات ہے۔ جس طرح تم ایک شفیق باپ ہونے کے باوجود اپنے بچے کو مارتے ہو اور اس میں ایک مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے، جس طرح ایک جراح مریض کا ہمدرد ہونے کے باوجود اس پر نشتر چلاتا ہے اور اس میں ایک حکمت مستور ہوتی ہے، جس طرح ایک سلطنت رعایا پر مہربان ہونے کے باوجود تعزیر و قصاص کے قوانین نافذ کرتی ہے اور اس میں ایک فائدہ متصور ہوتا ہے، بالکل اسی طرح کائنات عالم میں بہار و خزاں، نشیب و فراز، کون و فساد، موت و حیات کا جو سلسلہ جاری ہے، اس سب میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہے، مگر یہ ضروری نہیں ہے کہ اس مصلحت کو ہم سمجھ بھی لیں اور اگر وہ سمجھ میں نہ آئے تو خواہ مخواہ اس نظام کائنات کو لغو اور عبث خیال کر لیں۔ اس بحث میں جس موقع پر شاعر نے بظاہر خلاف مصلحت نظر آنے والے معاملات کی مصلحتوں پر روشنی ڈالی ہے وہاں شعر و حکمت گلے ملتے نظر آتے ہیں۔ کہتا ہے:

بہار گل پوش، آتش افگن خزاں میں تبدیل ہو رہی ہے
مگر تمھیں کیا خبر کہ اس میں چمن کی تکمیل ہو رہی ہے

تم اپنی پستی کا راز سوچو ہوس ہے گر سربلندیوں کی
کہ خود شناسی کی تہ میں پنہاں کلید ہے فتح مندیوں کی

حیات خوش مرگ تلخ سب میں غرض کوئی مصلحت ہے پنہاں
کہ رہنمائے شگفتگی ہے چمن کا شیرازۂ پریشاں

یہ منتشر کائنات وقف ارادۂ انتظام بھی ہے
جسے سمجھتے ہو ابتری تم اسی میں اس کا نظام بھی ہے

ان دلائل سے منکرین کے حجابات نظر کو چاک کر دینے کے بعد شاعر اپنی طرف سے وجود باری کے اثبات میں دو دلیلیں پیش کرتا ہے اور دونوں دل کو لگنے والی ہیں۔ اس کی پہلی دلیل یہ ہے کہ انسان کی فطرت خدا کو ڈھونڈ رہی ہے۔ جب سے انسان پیدا ہوا ہے، پیہم خدا کی تلاش میں ہے اور کسی نہ کسی صورت میں اس کی پوجا کر رہا ہے۔

یہ تلاش بے وجہ نہیں ہے۔ دراصل روح کی آنکھیں گلشن ہستی کی پتی پتی میں ایک جلوہ کو دیکھ رہی ہیں، دل کے کان کائنات کے ذرے ذرے کی خاموش زبان سے ایک پیام سن رہے ہیں۔ فطرت سلیمہ کے لطیف و نازک وجدانی احساسات پر ہر آن ہر جہت سے کچھ نرم نرم ضربیں پڑ رہی ہیں اور ان سب تجلیوں، صداؤں اور ضربوں نے اسے اس طرح بے چین کر رکھا ہے کہ وہ اس ہستی کو دیوانہ وار تلاش کر رہا ہے جو نظروں سے اوجھل ہے، مگر ہر وقت پہلو میں گدگدا رہی ہے۔

کسی نے سمجھا کہ سینہ سنگ میں یہ رنگیں نوا چھپی ہے
کسی نے آب رواں کے شیریں سروں میں اس کی تلاش کی ہے

کسی نے سورج کی شوخ کرنوں کے رقص میں اس کی جستجو کی
کسی نے آتش کو موج انوار جان کر اس کی آرزو کی

خدا نہیں گر تو پھر تلاش خدا میں یہ کارزار کیوں ہے
اگر یہ فطرت نہیں تو انسان کی روح پھر بے قرار کیوں ہے

دوسری دلیل یہ ہے کہ وہ نفوس قدسیہ جنھوں نے حق کی تلاش میں اپنی عمر کے بہترین لمحوں کو قربان کیا، اپنے نفس کی بے شمار لذتوں کو تج دیا، غور و فکر، گیان دھیان، مجاہدہ و مراقبہ میں عمریں صرف کر دیں، ایک زبان ہو کر خدا کے وجود کی شہادت دے رہے ہیں۔ ان لوگوں کی زندگیوں میں ہمیں کذب و افترا کا نشان تک نہیں ملتا۔ صرف یہی نہیں کہ خود ان کی زندگیاں معصیت کی آلودگی سے پاک ہیں بلکہ ان کے فیض و ہدایت نے دوسرے ابنائے نوع کو بھی بہیمیت کی سطح سے اٹھا کر انسان اور انسانیت کی سطح سے بلند کر کے انسان کامل بنا دیا ہے۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ ہم ان کو جھوٹا اور فریبی سمجھیں۔

جو ہر برائی سے احتراز اتم کی راہیں بتا رہے ہوں
ہزار صبر آزما مصائب شعار حق میں اٹھا رہے ہوں

ضمیر انسانیت کو باطل کی ظلمتوں سے بچانے والے
جو نشرِ حق کے لیے بنے ہوں وہ کیا کسی کو فریب دیں گے

ہزار ہو رہبر بلندی نشیب آخر نشیب ہو گا
وہ خیر ہی کے لیے سہی پھر فریب آخر فریب ہو گا

یہ اس نظم کی ایک مختصر تشریح ہے۔ اب قاعدۂ عام کے مطابق میرا دوسرا کام یہ ہونا چاہیے تھا کہ نظم کی زبان و انداز بیان پر شاعرانہ نقطہ نظر سے تبصرہ کرتا، مگر میں اس سے معافی چاہتا ہوں کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہ دوستانہ جنبہ داری سے احتراز کی کوشش میں شاید میں اپنے دوست سے انصاف نہ کر سکوں گا۔ تاہم میں کسی خوف کے بغیر اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ علی اختر صاحب ان لوگوں میں سے ہیں جو خیال کی نزاکت، فکر کی گہرائی، نظر کی وسعت اور بیان کی بلاغت کے اعتبار سے ہندستان کے جدید شعرا کی صف اول میں کھڑے ہونے کے قابل ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ نہ ان کی بے نیازی اپنے جوہر کی تشہیر پسند کرتی ہے اور نہ ان کی قوم میں اب وہ جوہر شناسی باقی ہے کہ ان کے کمال کی ازخود قدر کرے۔

(ابوالاعلیٰ مودودی - سابق ایڈیٹر رسالہ الجمعیت، دہلی)

قرآن میں دعوت و تبلیغ

تقاضے اور طریقہ کار

ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی

(دوسری اور آخری قسط)

استغفار داعی حق کی اہم خصوصیت ہے۔ یہ دعوت کی راہ کا وہ قیمتی سرمایہ ہے جو داعی کے اندر عجز و انکساری پیدا کرنے کا سبب اور رجوع الی اللہ یا تعلق باللہ کی راہیں ہموار کرنے میں معاون ہوتا ہے۔ دعوت کا کام بلاشبہ بڑا ہی شرف و عظمت کا حامل ہے لیکن یہ زعم کہ اس منصب جلیل پر فائز ہونے سے وہ خالق حقیقی کی تمام نعمتوں کا مستحق بن جاتا ہے اور اس کا شمار مقربین الی اللہ کی فہرست میں ہو جاتا ہے' شیطانی وسوسہ ہے۔ اس سے خدا کی پناہ مانگنی چاہیے۔ یہ اہل کتاب کا شیوہ تھا کہ اپنی قوم میں انبیا کی بعثت کے مقدس سلسلے کی بنا پر اپنے آپ کو تمام تر خدائی نوازشوں کا حق دار سمجھتے تھے اور نحن ابناء اللّٰہ کا دعویٰ کرتے تھے۔ مشرکین مکہ بھی اسی بات پر فخر کرتے تھے کہ فوز و فلاح دراصل انھی کی تقدیر میں ہے جب ہی تو مال و دولت اور اولاد جیسی نعمتوں سے اسی دنیا میں نواز دیا گیا ہے۔ (السبا ۳۴: ۳۵) اور جہاں تک آخرت میں ابدی مسرتوں کے حصول کا تعلق ہے تو' اولاً یہ بات ہی مشکوک ہے اور اگر اس زندگی کو تسلیم کر بھی لیا جائے تو وہ اپنے سفارشیوں کے ذریعے وہاں بھی کامیاب ہو جائیں گے۔

داعی کی ذمہ داری کسی بھی معاشرے میں غیر معمولی ہوتی ہے۔ بحیثیت انسان اس سے خطاؤں اور لغزشوں کا صدور ممکن ہوتا ہے خواہ دعوتی زندگی کے مرحلے میں ہو یا اپنی انفرادی و شخصی زندگی کے امور و مہمات میں ہو۔ جو جتنا زیادہ اپنے خدا کا محبوب ہوتا ہے' ابلیس کی سرگرمیاں اس کے ساتھ اتنی ہی بڑھی ہوئی ہوتی ہیں اور اس کے بھٹکنے کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ اس لیے خواہ خوشی و مسرت کا موقع ہو یا حزن و ملال کا' فوز و فلاح کی نعمت سے لطف اندوز ہونے کے لمحات ہوں یا ناکامی اور یاس و قنوطیت کے مظاہر سے سابقہ پڑا ہو' دعوت حق کے مثبت اثرات کی وجہ سے حلقہ احباب کا دائرہ وسیع ہو رہا ہو یا مخاطب کی ضد و ہٹ

دھرمی اور عناد و سرکشی کی وجہ سے بظاہر دعوت حق دلوں کو مسخر نہ کر پا رہی ہو اور افرادی قوت پر جمود طاری ہو گیا ہو، غرضیکہ ہر نرم و گرم اور خشک و تر حالات میں توبہ و استغفار کا دامن نہ چھوڑنا ہی داعی کے شایان شان ہے کیونکہ اس سے اللہ عزوجل کی تائید و نصرت اور اس کے نتیجے میں دونوں جہاں کی فیوض و برکات کا خزینہ ہاتھ آتا ہے۔ اس رجوع الی اللہ کی تعلیم وقت کے ہر پیغمبر نے اپنی قوم کو دی اور یقین دہانی کرائی کہ اس کے عوض آخرت کی ابدی اور حتمی زندگی کی لازوال مسرتوں کے علاوہ دنیا کی دولت و ثروت اور جاہ و حشمت سے بھی مخلص داعی حق کو نوازا جاتا ہے۔ (ھود ۱۱:۵۲، ۶۱، ۹۰، حم السجدہ ۴۱:۶، نوح ۷۱:۱۰-۱۲)

ہادی اعظمؐ کی ۶۳ سالہ حیات طیبہ دنیائے انسانیت کے لیے اس باب میں بھی بہترین نمونہ ہے۔ قرآن کے مالک نے اس داعی اعظمؐ سے بھی رجوع الی اللہ کا مطالبہ کیا اور اپنے محبوب ترین رسول کے ذریعے بندگان خدا کو یہ پیغام دیا، وَاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا (ھود ۱۱:۳) "اور یہ کہ تم اپنے رب سے توبہ و استغفار کرو، وہ تمھیں ایک مدت خاص تک متاع حسن سے نوازے گا"۔ آپؐ دنیائے انسانیت کے عظیم ترین نمائندہ اور اپنے خالق کے سب سے زیادہ چہیتے بندے اور رسولؐ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ کی سیرت کی سند خود مالک حقیقی نے دی، وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (القلم ۶۸:۴) "اور بلاشبہ تم عظیم ترین اخلاق کے درجے پر ہو"۔ اور فرما دیا: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب ۳۳:۲۱) "تم لوگوں کے لیے نبی کریمؐ کی زندگی میں ایک بہترین نمونہ ہے"۔

دعوت اسلامی کی تاریخ شاہد ہے کہ جب دشوار گزار مراحل کے بعد حلقہ اسلام میں لوگوں کی جوق در جوق شمولیت ہو رہی تھی، اس موقع پر بھی آپؐ کو اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۔ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۔ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ کی روشنی میں خالق دوجہاں کی تسبیح اور مغفرت طلبی کی تلقین فرمائی جاتی ہے۔ داعی اعظمؐ نے اسی لیے عالم انسانیت کو بالعموم اور امت مسلمہ کو بالخصوص اپنی دانستہ اور نادانستہ خطاؤں پر اظہار ندامت اور استغفار کی تاکید کی۔ سب سے زیادہ محبوب و برگزیدہ ہونے کے باوجود آپؐ کا یہ معمول تھا کہ توبہ و استغفار سے بے اعتنائی نہیں برتی بلکہ احادیث سے پتا چلا ہے کہ آپؐ تادم آخر توبہ و استغفار میں مصروف رہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے ایک روایت منقول ہے کہ آپؐ فرماتے تھے واللہ انی لا ستغفر اللہ واتوب الیہ فی الیوم اکثر من سبعین مرة (الصحیح للبخاری ج ۲ کتاب الدعوات، ص ۹۳۳) "خدا کی قسم دن بھر میں ستر سے زائد بار اللہ تعالیٰ سے (اپنی خطاؤں اور لغزشوں کی) مغفرت چاہتا ہوں اور اس کی طرف رجوع کرتا ہوں"۔

توبہ و استغفار کے باب میں قرآن اور صاحب قرآن کی تعلیمات امت مسلمہ کے ہر ہر فرد کے لیے نقوش راہ ہیں جن کے مطابق خود داعی کی سیرت مخاطبین کے حلقے میں عزو شرف کا موجب بن جاتی ہے اور

دعوت کے فروغ و اشاعت میں خدا کی برکتوں کا ظہور ہوتا ہے۔ ایسے ہی صالح نفوس کو اللہ تعالیٰ اپنی معیت و سرپرستی کی یقین دہانی کراتا ہے، وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ - اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (آل عمران ۳:۱۵-۱۶)، "اور اللہ ان بندوں پر نگاہ رکھتا ہے جو کہتے ہیں کہ آقا! ہم ایمان لائے، ہماری خطاؤں سے درگزر فرما اور ہمیں آتش دوزخ سے بچا لے"۔

دعوت حق اسی وقت برگ و بار لا سکتی ہے جب ایک طرف داعیانہ اوصاف و مطالبات سے اپنے آپ کو آراستہ کر لیا جائے اور دوسری طرف حکمت و دانائی کی متاع گراں حاصل کر لی جائے۔ تعلق باللہ، اخلاص وللہیت، صبر و استقامت، ہٹ دھرموں سے اعراض اور توبہ و استغفار، وہ مطلوبہ اوصاف ہیں جن سے داعی کی پاک شخصیت منظر عام پر آ جاتی ہے اور وہ حلقہ مخاطبین میں عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ حکمت و دانائی سے عاری ہو کر بسا اوقات وہ اپنی شخصیت کو داغ دار کر لیتا ہے اور دعوت حق کی عظمت و تقدس کی پامالی کا سبب بن جاتا ہے۔ حکیمانہ انداز داعی کی پیش کردہ دعوت کو زیادہ پر تاثیر بنا دیتا ہے اور اس کی بدولت بعض مشکل ترین مسائل حل ہو جاتے ہیں۔ اس لیے حکمت و دانش مندی دعوت حق کے فروغ اور اس کی قبولیت کا دائرہ وسیع کرنے میں بہت مفید ثابت ہوتی ہے۔ قرآن میں اسے ایک بہت بڑی دولت قرار دیا گیا ہے۔ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا (البقرہ ۲:۲۶۹)، "اور جس کو حکمت ملی، اسے حقیقت میں بڑی دولت مل گئی"۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دعوت و تبلیغ کی ذمہ داری انجام دینے والے معزز بندوں کو ہدایت کرتا ہے: اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ (النحل ۱۶:۱۲۵)۔

حکمت عملی متعدد تقاضوں پر مشتمل ایک جامع لفظ ہے جن میں ایک یہ ہے کہ مخاطب کو قول بلیغ اور قول لین سے خطاب کیا جائے۔ داعی کی زبان میں اگر اثر آفرینی و دل نشینی کا وصف معیار مطلوب تک پایا جاتا ہو تو خوش آیند نتائج کی توقع یقین کی حد تک بڑھ جاتی ہے۔

چونکہ عوام و خواص دونوں ہی اس دعوت کے مخاطب ہوتے ہیں اس لیے داعی کو اختصار اور طوالت، جہاں جس چیز کی ضرورت ہو، استعمال کرنا چاہیے۔ مدعو کے ماحول اور اس کے حالات کا علم، اس کے مبلغ علم کا خیال، ضرورت کے مطابق امور و معاملات میں شرح و بسط کا طریقہ اختیار کرنا یا ایجاز و اختصار کے ساتھ دعوت کے متعلقہ پہلوؤں کی وضاحت کرنا اور دل نشین پیرایہ بیان اختیار کرنا سب اسی قول بلیغ کا حصہ ہیں جس کی داعی کو تلقین کی جاتی ہے۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيْغًا (النساء ۴:۶۳)، "جو کچھ ان کے دلوں میں ہے اسے اللہ جانتا ہے۔ ان سے تعرض مت کرو انھیں سمجھاؤ اور ایسی نصیحت کرو جو ان کے دل میں اتر جائے"۔

دعوت کا اصل مقصد مدعو کی زندگی میں ایک انقلاب برپا کرنا ہے۔ جتنا موثر اور دل نشیں پیرایہ بیان

اختیار کیا جائے گا اتنا ہی اس کا حصول آسان ہو جائے گا۔ داعی کے دل میں یہ خیال کہ مخاطب مانے یا نہ مانے میرا اجر میرے خدا کے پاس محفوظ ہے' داعی کی خود غرضی ظاہر کرتا ہے اور دوسری طرف قول بلیغ کے حکم سے انحراف بھی ہے۔ بلاشبہ داعی داروغہ یا وکیل نہیں ہے کہ جیسے بھی ہو اس سے اپنی بات منوا لے اور اس کو اپنی زندگی کا رخ موڑ دینے پر مجبور کر دے یہ دعوت کی عظمت و وقار کے خلاف بھی ہے اور داعی کی شان کے خلاف بھی۔ لیکن یہ تو داعی کا فرض ہے کہ وہ دعوت اور مدعو سے متعلق تمام احوال و کوائف کے پیش نظر اقدام کرے اور حکمت کے ساتھ دعوت پہنچائے۔

دعوت و تبلیغ کا کام کسی مخصوص معاشرے یا ملک میں ہی نہیں ہوتا بلکہ پوری انسانی برادری اللہ کی اس عظیم نعمت کی مخاطب ہے۔ اس لیے ہمیں اقوام عالم کی زبانوں اور علوم و معارف سے بھی شناسائی حاصل کرنی ہوگی۔ ہم خواہ کسی بھی ملک میں رہتے بستے ہیں' ایک بڑی اکثریت ایسے مخاطبین کی بھی ہوتی ہے جو ہماری دعوت کی زبان تک نہیں سمجھتے۔ اس لیے فریضہ حق کی ادائیگی کے لیے کم از کم مدعو یا مخاطب معاشرے کی زبان سمجھنا پڑے گی اور ان پر دعوت کو کارگر اور موثر بنانے کے لیے وقت کے چیلنج کے مطابق اپنے مبلغ علم کو بڑھانا ہوگا۔ ایک داعی جو مدعو کی زبان میں معاملات کو واضح کر رہا ہو' وہ اللہ کی نگاہ میں ان پڑھ داعی کے مقابلے میں زیادہ محبوب ہے۔ وقت کی زبان میں اور پڑھے لکھے انداز میں دین کی دعوت پیش کرنے سے ماحول اور معاشرے میں ذہنی و فکری انقلاب تو آتا ہی ہے لیکن اس کے نتیجے میں جو شخص دعوت حق کو قبول کرتا ہے' وہ بھی ذہن و فکر کے لحاظ سے پختہ و مستحکم ہو جاتا ہے۔ دنیا کا کوئی لالچ یا کسی مخلوق کا کوئی خوف اس کے قدموں میں لغزش پیدا نہیں کر سکتا۔ مزید برآں داعی کی شخصیت معاشرے میں اور بھی زیادہ محبوب بن جاتی ہے۔ اسلام کی دعوت بیسویں صدی کی زبان میں پیش کر دینے کے نتیجے میں ہدایت کی پیاسی دنیا اسلام کے چشمہ صافی سے سیراب ہونے کے لیے دوڑے گی۔

نرم گفتگو یا شیریں کلامی بھی جسے قرآن "قول لین" سے تعبیر کرتا ہے' ایک اعلیٰ جوہر ہے جو قول بلیغ کے ہی ضمن میں آتا ہے۔ یہ وصف مدعو کے قلب و ضمیر پر دیرپا نقش ثبت کرتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ داعی اور مدعو کے اعتقاد و عمل کا اختلاف دونوں کو دو مختلف سمتوں میں کھڑا کر دیتا ہے۔ داعی اپنے فکر و نظر اور عمل سے عشق رکھتا ہے اور مدعو بھی اپنے اعتقاد و عمل کو عزیز رکھتا ہے۔ لیکن دعوت داعی کا فرض منصبی ہے۔ اس لیے تصادم کے جذبات کو بالائے طاق رکھ کر مدعو کو دعوت حق سے روشناس کرانا خود اس کے وجود کے لیے لازمی ہے۔ اس لیے یہاں داعی کو جذباتیت کے بجائے نرمی و متانت سے کام لینے کی ضرورت پڑتی ہے۔

قرآن میں متعدد مقامات پر موسیٰ و فرعون کے واقعات بیان کیے گئے ہیں جو دعوت و تبلیغ کے مراحل

میں راہ نما نقوش کا کام کرتے ہیں۔ فرعون نے خالق حقیقی کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا۔ بحر و بر اور خشکی و تری کو اپنی منحوس اور ناپاک حرکتوں سے بھر دیا اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کر دیا یہاں تک کہ اپنے آپ کو ربوبیت کے منصب پر لا کھڑا کیا۔ تب وقت کے پیغمبر حضرت موسیٰؑ کو اپنے بھائی کی معیت میں فرعون تک دعوت حق پہنچانے کا حکم صادر ہوتا ہے لیکن یہ حکم بھی دیا جاتا ہے کہ شدت و سختی اور جوش و گرمی کے بجائے نرم مزاجی' متانت و سنجیدگی اور شیریں بیانی کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ موسیٰؑ و ہارونؑ کو ربانی ہدایات ملتی ہیں' اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ - اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى - فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى (طٰہٰ ۲۰:۴۲-۴۴) ''تو اور تیرا بھائی میری نشانیوں کے ساتھ جا اور دیکھو تم لوگ میری یاد میں کوتاہی نہ کرنا۔ تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ کہ وہ سرکش ہو گیا ہے۔ اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا' شاید کہ وہ نصیحت قبول کرے یا ڈر جائے''۔

موسیٰؑ و فرعون کے واقعے کو قرآن نے متعدد مقامات پر بیان کر کے رسول اکرمؐ کو ماضی کی تاریخ سے روشناس کرایا ہے اور یہ بتایا ہے کہ اگر آپؐ کی دعوت حق کے بالمقابل ابولہب' ابوجہل' عتبہ' ولید اور دوسرے علم برداران کفر سرگرم عمل ہو کر آپؐ کو اور آپؐ کی دعوت کو زک پہنچانے کی سازشیں کر رہے ہیں تو کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ ایسا پہلے بھی ہو چکا ہے۔ پیغمبر اور ان کے اہل ایمان رفقا پر مظالم و شدائد کے ایسے سخت پہاڑ توڑے گئے کہ انھیں متی نصر اللہ کی آواز بلند کرنا پڑی۔ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ - مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ (البقرہ ۲:۲۱۴) ''حالانکہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکا ہے۔ ان پر سختیاں گزریں' مصیبتیں آئیں' ہلا مارے گئے' حتیٰ کہ وقت کا رسول اور اس کے ساتھی اہل ایمان چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی''۔

تاریخ بتاتی ہے کہ مکہ میں آپؐ نے سربراہان کفر و شرک سے معاہدہ نہیں کیا اور نہ ہی شرک و بت پرستی کی لعنتوں میں گرفتار زعمائے قریش اور دوسرے اساطین عرب سے دعوت و تبلیغ کے معاملے میں گریز اختیار کیا۔ حکمت و دانائی کی بیش بہا دولت سے متمتع ہوتے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کے قول: فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ کے دل میں بسا لینے کے بعد یہ کیسے ممکن تھا کہ آپؐ قوم کے معززین سے سخت و سست انداز میں گویا ہوتے۔ چنانچہ آپؐ نے انفرادی طور پر اور اجتماعی طور پر' عمومی نشستوں میں بھی اور خصوصی نشستوں میں بھی سرداران قریش اور دیگر زعمائے عرب کے سامنے دعوت دین پیش کی لیکن ایک مثالی داعی کا کردار کبھی فراموش نہ کیا۔ آج لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں ایسے لوگ ہیں جن تک دین کی دعوت نہیں پہنچائی گئی ہے۔ اگر دعوتؐ کی مبارک کوشش کا آغاز ہوتا بھی ہے تو مباحثہ و مناقشہ' سختی و شدت پر منتج ہو

جاتی ہے۔ نتیجتاً داعی مدعو کے قلب و ضمیر پر خوش آیند نقوش نہیں چھوڑ پاتا اور بسااوقات دعوت دین سے متنفر کرنے کا محرک بن جاتا ہے۔ ادع الی سبیل ربک الایہ کے تحت ایک معروف عالم دین کی وضاحت قابل توجہ ہے:

"اس میں اللہ کی خاص صفت ربوبیت اور پھر اس کی نبی کریمؐ کی طرف اضافت میں اشارہ ہے کہ دعوت کا کام صفت ربوبیت اور تربیت سے تعلق رکھتا ہے۔ جس طرح حق تعالیٰ نے آپ کی تربیت فرمائی، آپ کو بھی تربیت کے انداز سے دعوت دینا چاہیے۔ خود لفظ دعوت بھی اس مفہوم کو ادا کرتا ہے کہ پیغمبر کا کام صرف اللہ کے احکام پہنچا دینا اور سنا دینا نہیں بلکہ لوگوں کو ان کی تعمیل کی طرف دعوت دینا ہے اور ظاہر ہے کہ کسی کو دعوت دینے والا، اس کے ساتھ ایسا خطاب نہیں کرتا جس سے مخاطب کو نفرت و وحشت ہو" (مفتی محمد شفیع، معارف القرآن، ج ۵، ص ۴۰۸)۔

قرآنی آیات کی روشنی میں حکمت کے تحت داعی حق کے لیے جو دوسرا اصول مستنبط ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ مدعو کی نفسیات کو ملحوظ رکھا جائے۔ معاشرے کے معزز و محترم لوگوں کو خطاب اس بھونڈے انداز سے نہ ہو کہ ان کی عزت نفس کو دھچکا لگے۔ داعی کو اپنی دعوت ایسے موقع پر پیش کرنے سے احتراز کرنا چاہیے جب مدعو دوسری قسم کی دلچسپیوں اور ضرورتوں میں مصروف و منہمک ہو۔ مخاطب کی صلاحیت و لیاقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے دل نشیں پیرایہ بیان اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ اہل علم اور عوام دونوں قسم کے مخاطبین کو الگ الگ انداز سے دعوت دی جائے گی۔ بے جا ٹکراؤ اور طول بیانی بعض اوقات داعی اور دعوت سے متعلق منفی اثرات کے محرک بنتے ہیں۔ اس لیے اس طریقہ تبلیغ سے گریز کرنا بھی داعی کی حکمت عملی میں شامل ہے۔ مدعو خواہ اہل ثروت طبقے سے تعلق رکھتا ہو یا فقرا و مساکین کی جماعت سے، ہر ایک عزت نفس رکھتا ہے۔ اس لیے اس بات کا خیال کرنا چاہیے کہ طریقہ تبلیغ سے اس کی ذلت و رسوائی نہ ہو۔ یہ ساری مشقیں مخاطب کی نفسیات سے متعلق ہیں جو داعی کے لیے دعوت و تبلیغ کے مراحل میں توشہ راہ بن سکتی ہیں۔

اگر دعوت کے مخاطبین وہ لوگ ہوں جن کے دل وحدت الٰہ کی بجائے معبودان باطل کا مسکن بنے ہوں تو داعی کو معبودان باطل اور ان کے عقیدت مندوں پر لعن و طعن سے گریز کرتے ہوئے مدعا و مقصود کو پیش کرنا چاہیے۔ قرآن اس سلسلے میں داعیان حق کو تنبیہ کرتا ہے: وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ (الانعام ۶:۱۰۸)، "اور (اے مسلمانو) یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں، انھیں گالیاں نہ دو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شرک سے آگے بڑھ کر جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں"۔

قرآن مجید میں متعدد مقامات پر مدعو کی نفسیات کے لحاظ کی مثالیں ملتی ہیں۔ خالق کائنات کے وجود سے متعلق

عقلی استدلال کے بعد قرآن کا یہ تبصرہ ملاحظہ ہو: ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ (الزمر ۳۹:۶)، "یہی اللہ (جس کے یہ کام ہیں) تمھارا رب ہے، بادشاہی اسی کی ہے، کوئی معبود اس کے سوا نہیں ہے، پھر تم کدھر سے پھرائے جا رہے ہو؟" پھر یہ کہنے کے بجائے کہ تم کہاں بھٹک رہے ہو یا تمھارے معبودوں نے ان حقائق کے باوجود تم کو کیوں بھٹکا دیا ہے، یہ کہا جا رہا ہے کہ آخر ان ساری حقیقتوں کے باوجود تم کہاں پھرائے جا رہے ہو۔ اس لطیف پیرایہ بیان میں نہ مدعو کی ذہنیت پر چوٹ کی جا رہی ہے اور نہ مخاطب کے معبودان باطل پر کوئی حملہ کیا جا رہا ہے۔ یہ نکتہ ذہن نشین کرانا مقصود ہے کہ گمراہ کرنے والے کچھ لوگ یقیناً ہیں اور اب یہ فیصلہ کرنا خود اس کا کام ہے کہ وہ ٹھنڈے دل سے سوچے کہ اسے صراط مستقیم سے پھیرنے میں کون لوگ اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ قرآن میں حکمت عملی کے اس پہلو کو متعدد مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔ (الانعام ۶:۹۵، یونس ۱۰:۳-۴، فاطر ۳۵:۳، یونس ۱۰:۳۲) سید مودودیؒ اس طریقہ دعوت کی حکمت پر گویا ہیں:

"خیال رہے کہ خطاب عام لوگوں سے ہے اور ان سے سوال یہ نہیں کیا جا رہا ہے کہ تم کدھر پھرے جا رہے ہو بلکہ یہ ہے کہ تم کدھر پھرائے جا رہے ہو۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ کوئی ایسا گمراہ کن شخص یا گروہ موجود ہے جو لوگوں کو غلط رخ پر پھیر رہا ہے۔ یہ طرز سوال جگہ جگہ ایسے مواقع پر قرآن میں اختیار کیا گیا ہے اور ہر جگہ گمراہ کرنے والوں کا نام لینے کے بجائے ان کو صیغہ مجہول کے پردے میں چھپا دیا گیا ہے تا کہ ان کے معتقدین ٹھنڈے دل سے اپنے معاملے پر غور کر سکیں اور کسی کو یہ کہہ کر اشتعال دلانے کا اور ان کا دماغی توازن بگاڑ دینے کا موقع نہ ملے کہ دیکھو، یہ تمھارے بزرگ اور پیشواؤں پر چوٹیں کی جا رہی ہیں" (تفہیم القرآن، ج ۲، ص ۲۸۲)۔

معروضی طرز استدلال، حکمت عملی کے تقاضوں میں ایک اہم تقاضا ہے جس کے ذریعے ایک طرف داعی کے حلم و بردباری اور ذہانت و فطانت سے متعلق احساسات و تاثرات مدعو کے صفحہ دل پر نقش ہو جاتے ہیں اور دوسری طرف مخاصمت و چپقلش کے بغیر مخاطب کو اپنا حلیف و ہمنوا بنا لیا جاتا ہے۔ داعی کو ایسے انداز سے گریز کرنا چاہیے جس سے مخاطب کے دل و دماغ پر یہ نقش قائم ہو کہ داعی ہمارا خیر خواہ نہیں بلکہ معاند و مخالف ہے۔ اس انداز دعوت سے اجتناب کرتے ہوئے اپنی دعوت میں انتہائی دلنشیں انداز پیدا کرنا چاہیے۔ یہ بہت ممکن ہے کہ ہمارے اس معروضی طرز استدلال اور مثبت انداز کا اثر یہ ہو کہ جو بات مدعو کے گوش گزار کی جا رہی تھی، وہ اس کی زبان پر بے ساختہ آجائے یا کم از کم سوچنے پر مجبور ہو جائے۔

قرآن کریم میں انبیا کی دعوتوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وقت کے ہر پیغمبر نے معروضی طرز استدلال کو دعوت کا ایک اہم ذریعہ قرار دیا اور قوم سے خطاب کے وقت اس کو کبھی نظرانداز نہیں کیا۔

حکمت عملی کے اس پہلو کی مثال حضرت ابراہیم علیہ السلام کی داعیانہ زندگی میں نمایاں طور سے ملتی ہے۔ وقت کا بادشاہ نمرود خدائی کے زعم میں گرفتار ہو کر خلیلؑ اللہ اور ان کی دعوت حق کو ناکام کرنا چاہتا ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر بادشاہ وقت، داعی اعظم سے پوچھتا ہے کہ تمھارا رب کون ہے؟ حضرت ابراہیمؑ فرماتے ہیں کہ جس ہستی کے قبضہ قدرت میں موت و حیات کے فیصلے ہیں، دراصل وہی ہستی رب کہے جانے کے لائق ہے۔ نمرود نے خدائی کے نشے میں بدمست ہو کر کہا کہ مارنا اور جلانا میرے ہاتھ میں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم مجھے رب مانتے ہو۔ اللہ کی کتاب بتاتی ہے کہ آپ نمرود کے اس باغیانہ اظہار پر برانگیختہ نہیں ہوئے۔ دعوت پیش کرنے کا یہ زریں موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا اور انتہائی متانت کے ساتھ کہا: "ٹھیک ہے، تم بھی مارتے اور جلاتے ہو، لیکن میرا رب سورج کو مشرق سے طلوع کرتا ہے۔ کیا تو اپنی خدائی کے ثبوت میں اسے مغرب سے طلوع کرا سکتا ہے؟ اگر تم اس پر قادر ہو تو خدائی تسلیم کر لی جائے گی"۔ منکر حق اس پر زور استدلال کی تاب نہ لا سکا اور وہ سراپا استعجاب بن گیا۔ اِذْ قَالَ اِبْرٰھٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ۔ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ - قَالَ اِبْرٰھٖمُ فَاِنَّ اللّٰہَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِھَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُھِتَ الَّذِیْ کَفَرَ (البقرہ ۲:۲۵۸)، "جب ابراہیمؑ نے کہا کہ میرا رب وہ ہے جس کے اختیار میں زندگی اور موت ہے، تو اس نے جواب دیا: زندگی اور موت میرے اختیار میں ہے۔ ابراہیمؑ نے کہا: اچھا، اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے۔ تو ذرا اسے مغرب سے نکال لا۔ یہ سن کر وہ منکر حق ششدر رہ گیا"۔

قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی قوم خدا کی خدائی کا انکار کرنے والوں میں سے نہیں تھی، ہاں خدائے واحد کے علاوہ دوسرے معبودان باطل کو بھی اپنی بندگی کا مستحق سمجھتی تھی یعنی شرک اس قوم کے رگ و ریشے میں سرایت کر گیا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ عقل و فطرت کی روشنی میں جب ایک خدا کی خدائی کو سمجھ گئے تو شرک و بت پرستی میں ملوث قوم کے بڑوں کو خاطر میں لائے بغیر بڑی جرات و بے باکی کے ساتھ معبودان باطل کی بے بضاعتی بیان کی۔ آپ نے قوم کو بتایا کہ تم فی الحقیقت رب حقیقی کی ربوبیت اور معبود مطلق کی عبادت میں کسی اور کو شریک کر کے سنگین جرم کا ارتکاب کر رہے ہو، حالانکہ جن لوگوں کو تم نے شرکا کا درجہ دے رکھا ہے، انھیں اللہ یا اس کے رسول نے کوئی سند نہیں دی ہے۔ جہاں تک رہا میرا معاملہ تو میں نے معبود حقیقی کی رضا کو اپنی زندگی کا مقصد مانا ہے۔ اس آئینے میں حقیقت حال کا مشاہدہ کرو اور سمجھو کہ اللہ رب العزت کی عطا کردہ سکینت و طمانیت کی نعمت بیش بہا کا فی الواقع مستحق کون ہے۔ اس براہیمی طریقہ استدلال کو اللہ کی کتاب یوں بیان کرتی ہے: وَکَیْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَکْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّکُمْ اَشْرَکْتُمْ بِاللّٰہِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِہٖ عَلَیْکُمْ سُلْطٰنًا - فَاَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (الانعام ۶:۸۱)، "اور آخر میں تمھارے ٹھیرائے ہوئے شریکوں سے کیسے ڈروں جبکہ تم اللہ کے ساتھ ان

چیزوں کو خدائی میں شریک بناتے ہوئے نہیں ڈرتے جن کے لیے اس نے تم پر کوئی سند نازل نہیں کی ہے؟ ہم دونوں فریقوں میں کون زیادہ بے خوفی و اطمینان کا مستحق ہے؟ بتاؤ اگر تم کچھ علم رکھتے ہو"۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی داعیانہ سیرت مبارکہ میں یہ پہلو اور بھی نمایاں طریقے سے سامنے آتا ہے کہ آپؐ نے دعوت حق کی ترویج و اشاعت میں کوئی ایسا طریقہ نہیں اختیار کیا جس سے مخاطب کی عزت نفس پر آنچ آئے۔ داعی اگر حکمت سے مالا مال ہو تو دعوت میں کامیابی یقینی ہو جاتی ہے۔ داعی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی حکمت دعوت کی بے شمار مثالیں قرآن کے صفحات میں قیمتی موتیوں کی طرح بکھری ہوئی ہیں۔

قرآن کے اول مخاطب اہل مکہ تھے اور ان میں بھی وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ کے تحت قریش مکہ کو حضورؐ کی دعوت کے مخاطب اول ہونے کا شرف حاصل تھا لیکن ان لوگوں نے ہی قرآن اور صاحب قرآنؐ کو سب سے زیادہ اپنی اوچھی حرکتوں کا نشانہ بنایا۔ قرآن کو سحر اور شاعری کہا اور صاحب قرآن کو شاعر و ساحر۔ تکذیب نبوت کے لیے انسانی کلام اور من گھڑت افسانہ کہنے سے بھی گریز نہیں کیا (الفرقان ۲۵:۴-۵)۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن اور صاحب قرآنؐ سے متعلق کفار و مشرکین کے اعتراضات پر گرفت کی اور اپنے رسولؐ سے کہلوا دیا کہ اگر وہ اپنے دعوے میں سچے ہیں تو وہ ایسی ہی کتاب پیش کر دیں (بنی اسرائیل ۱۷:۸۸)۔ ایک داعی کو دعوت کے اس مرحلے میں جبکہ طرح طرح کے اختلافات و اعتراضات سامنے لائے جا رہے ہوں، کس طرز استدلال سے کام لینا چاہیے اور مخاطب کو کس حکمت عملی کے تحت مسکت جواب دینا چاہیے، وحی الٰہی کے مطابق نبی کریمؐ کے اس جواب میں ایک بہترین نمونہ ملتا ہے۔ واضح رہے کہ حکمت کے تحت آغاز ہی میں جھوٹ اور بے بنیاد کہہ کر مخاطب کے جذبات کو مجروح نہیں کیا گیا اور یہ تاثر نہیں چھوڑا گیا کہ داعی فریق مخالف ہے جو مدعو سے تصادم کا طلب گار ہے بلکہ اس انداز جواب سے مدعو کو یہ تاثر دیا گیا کہ داعی حقیقت پسندی اور ہمدردی و محبت کا خوگر ہے اور مدعو کا صداقت سے انکار و انحراف اس پر شاق گزرتا ہے۔ ایک پوری کتاب پیش کرنے کے مطالبے کے بعد مخاطبین کو بالترتیب دس سورتیں یا اس جیسی ایک ہی سورۃ اپنے دعوے کی صداقت میں پیش کرنے کا مطالبہ دعوت کی عظمت کو مزید معنی خیز بنا دیتا ہے۔ (ھود ۱۱:۱۳، یونس ۱۰:۳۸)

مدعو کی جانب سے حائل کی گئی مصائب و مشکلات کی وادیوں کو حسن سلوک اور عمل خیر سے سر کرنا اور انتقام سے احتراز کرنا، حکمت عملی کے باب میں ایک اور اہم اصول ہے جو داعی اور مدعو کے باہمی رشتوں کو خوشگوار بناتا ہے۔ اگر مخاطب اپنے آبا و اجداد کے دین کے خلاف داعی کی بات تک سننا گوارا نہیں کرتا، اسے طنز و تعریض کا نشانہ بناتا ہے اور بعض اوقات اس کی کامیابی کی راہ میں روڑے اٹکاتا ہے تو یہ مراحل بلاشبہ ناخوشگوار اور صبر آزما ہوا کرتے ہیں۔ لیکن داعی کو دعوت کی راہ میں ان پیش آمدہ مصائب و مشکلات کو

انگیز کرنا چاہیے، اس یقین کے ساتھ کہ وہ اللہ کے مقدس مشن کو دنیاے انسانیت تک پہنچانے میں لگا ہوا ہے۔ اسے اپنی طرف سے اوچھے پن کا ثبوت نہیں دینا چاہیے اور نہ ہی مخاطب کی بدسلوکیوں پر مشتعل ہو کر انتقامی جذبات کے ساتھ اسے بھی تکلیف پہنچانے پر آمادہ ہو جانا چاہیے۔ انتقامی کارروائی محض مخاطب کے ساتھ ایک انتقامی کارروائی ہی نہیں ہوتی بلکہ اس کی وجہ سے مخاطب کے دعوت حق سے متنفر ہونے کے خدشات بڑھ جاتے ہیں اور معاشرے کے دیگر افراد کی نگاہوں میں داعی، دعوت اور مدعو کے درمیان مختلف قسم کے شکوک و شبہات حائل ہو جاتے ہیں۔ قرآن کا فلسفہ یہ ہے کہ اگر دلوں کی دنیا پر حکمرانی کرتے ہوئے مدعو کو اپنا حلیف و ہمنوا بنانا ہو تو اس کی شرپسندی کا جواب محبت اور خیر سگالی سے دینا چاہیے اور سیئات و منکرات کا قلعہ خیرات و حسنات کے ذریعے فتح کرنا چاہیے۔ کتاب اللہ دعوت سے متعلق اسی فلسفے کی تلقین کرتی نظر آتی ہے۔ وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۔ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ (حم السجدہ ۴۱:۳۴) "اور اے نبیؐ" نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔ تم بدی کو اس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو۔ تم دیکھو گے کہ تمھارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی، وہ جگری دوست بن گیا ہے"۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تمام خطہ ہاے عالم اور تمام شعبہ ہاے زندگی کے لیے مکمل اسوہ ہیں۔ انتقام سے پاک جذبات اور عفو عام کی جو معجزانہ مثال ہمیں سیرت طیبہؐ میں ملتی ہے اس کا عشر عشیر بھی کسی حکمران قوم، کسی قائد تحریک اور کسی امیر جماعت میں نظر نہیں آتا ہے۔ دعوت و تبلیغ کی پرخار وادیوں سے گزرتے ہوئے آپؐ کفار و مشرکین کے انتہائی مذموم اور معاندانہ سازشوں کا نشانہ بنے۔ آپؐ کے اخلاص و للّٰہیت پر طنز کیا گیا اور اسے شکوک و شبہات کا ہدف بنایا گیا۔ حرص و طمع کے دام میں گرفتار کرنے کے لیے سطحی اور اوچھی سازشیں رچائی گئیں، وحدت الٰہ کا علم بلند کرنے اور دعوت حق کے فروغ و اشاعت کی جدوجہد کے جرم میں آپؐ کو شعب ابی طالب میں قیدی بنایا گیا اور حقہ پانی بند کر دیا گیا۔ اللہ کے اس محبوب ترین بندے کے ساتھ خود اللہ کے گھر میں گستاخانہ اور اخلاق سوز حرکتیں کی گئیں اور بلاشبہ انسانیت کی پیشانی پر یہ کلنک کا ٹیکہ ہے کہ پیغمبرؐ وقت اور محبوبؐ خدا کے ساتھ دیار طائف میں انتہائی سفاکانہ اور انسانیت سوز حرکتیں کی گئیں۔ ہادی اعظمؐ کا مقدس خون صرف اس بنا پر طائف کی سرزمین پر ٹپکا کہ آپؐ بھٹکی ہوئی انسانیت کو ہدایت کی شاہراہ دکھلا رہے تھے۔ آپؐ نے ان تمام ناسازگار احوال میں نہ صرف یہ کہ انتقام سے گریز کیا بلکہ رشد و ہدایت کی دعائیں کیں اور عفو و درگزر کا پروانہ عام دے دیا۔ طائف میں ہادی اعظمؐ کے ساتھ وحشیانہ سلوک کے نتیجے میں پہاڑوں کے منتظم فرشتے کا نزول اور اہل طائف کو بھسم بنا دینے کی پیش کش اور اس پر رحمت عالمؐ کی رحیمانہ شان کا مظاہرہ اور فتح مکہ کے موقع پر آپؐ کے قتل کی سازشیں کرنے

والوں' صحابہ کرامؓ کو گرم گرم ریت پر لٹا کر ان کے سینوں پر پتھر رکھنے والوں' دعوت حق اور اس کے علم برداروں کو زک پہنچانے والوں اور سالہا سال تک حق و باطل کی کش مکش میں نبرد آزما ہونے والوں اور بدر و حنین و خیبر و خندق میں امامت و پیشوائی کا علم اٹھانے والوں کے' خانہ کعبہ کے صحن میں سرنگوں کھڑے ہونے کے باوجود' آپؐ نے عفو و درگزر اور رحم و کرم کے جس عظیم الشان اور معجزانہ کردار کا مظاہرہ کیا' تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں پیش کی جا سکتی۔

اللہ رب العزت کی عطا کردہ عظیم ترین نعمت اسلام کو بلافرق و امتیاز پوری انسانیت تک پہنچانا امت کے ہر ہر فرد کا فرض منصبی ہے۔ اپنی صلاحیت و لیاقت کے مطابق ہر فرد امت اس مقدس مشن کا پیامی ہے۔ دعوت و تبلیغ ہی امت مسلمہ کی شناخت اور اس کی اصل روح ہے جس کے بغیر امت ایک بے روح جسم ہے۔ اللہ کے دین سے لوگوں کو روشناس کرانا' معروفات کی ترغیب اور اس کے فروغ کی جدوجہد نیز منکرات سے نفرت دلانا اور ان سے احتراز و اجتناب کی دعوت' انتہائی مبارک عمل اور انبیا کرامؑ کی عظیم ترین سنت ہے۔ اس راہ میں جبر و اکراہ' دعوت کی عظمت اور داعی کی شان کے خلاف ہے۔ دعوت کے اس انتہائی مقدس سفر میں تعلق باللہ' اخلاص و للّٰہیت' صبر و استقامت' ہٹ دھرموں سے اعراض اور توبہ و استغفار' زاد راہ ثابت ہوتے ہیں اور دوسری طرف یہ داعی کی بے لوث شخصیت کو میدان عمل میں لا کھڑا کرتے ہیں۔ داعی حق کی مثالی زندگی میں حکمت عملی ایک گراں قدر دولت ہے۔ مخاطب کو اس کی زبان میں دعوت' اس کی نفسیات کا لحاظ' شیریں کلامی' معروضی طرز استدلال' انتقام سے احتراز اور عفو و درگزر کا سلوک' وہ عناصر ہیں جن سے داعی کی شخصیت میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ دریا کی کوئی طغیانی' سمندر کی کوئی لہر اور ہواوں کا کوئی جھونکا اس کے پایہ استقامت میں لغزش نہیں لا سکتا۔ دعوت حق کی عظمت و تقدیس کے نقوش مخاطبین کے دل و دماغ پر ثبت ہو جاتے ہیں اور بالآخر شبانہ روز جدوجہد رنگ لاتی ہے اور پھر خدا کی یہ زمین مادی اور روحانی فیوض و برکات سے معمور ہو کر جنت نشاں بن جاتی ہے۔

ہمیشہ اس دنیا میں رہنا نہیں ہے۔

آخرکار' دیر یا سویر' جانا خدا ہی کے پاس ہے'

لہٰذا کیوں نہ اسی کی راہ میں جان لڑا کر اس کے حضور حاضر ہوں۔

یہ اس سے لاکھ درجے بہتر ہے کہ ہم اپنے نفس کی پرورش میں لگے رہیں'

اور اسی حالت میں' اپنی موت ہی کے وقت پر'

کسی بیماری یا حادثے کا شکار

ہوں!

(تفہیم القرآن ' جلد اول' ص ۴۷)

(خیر خواہ)

اپنی رقم خرچ کرنے کے بارے میں

مولانا عبد المالک

حضرت ابو ہریرہؓ روایت فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صدقہ کرو!
ایک آدمی نے عرض کیا: یارسولؐ اللہ ' میرے پاس ایک دینار ہے۔
آپؐ نے فرمایا: اسے اپنے نفس پر صدقہ کردو۔
اس آدمی نے کہا: میرے پاس ایک اور دینار بھی ہے۔
آپؐ نے فرمایا: اسے اپنی بیوی پر صدقہ کردو۔
اب اس نے کہا: میرے پاس ایک اور دینار بھی ہے۔
آپؐ نے فرمایا: اسے اپنی اولاد پر صدقہ کردو۔
کہا: میرے پاس ایک اور دینار ہے۔
آپؐ نے فرمایا: اسے اپنے خادم پر صدقہ کردو۔
اس نے کہا: میرے پاس ایک اور دینار ہے۔
آپؐ نے فرمایا: تم زیادہ بہتر سمجھتے ہو۔ (مسند احمد - ابن حبان)

☆ اپنے اوپر' اہل و عیال پر اور ضروریات پر جو خرچ کیا جاتا ہے' اس کے بارے میں عام تصور یہ ہے کہ یہ تو لامحالہ کرنا ہی ہوتا ہے' اس کا دین سے کیا تعلق؟ یہاں یہ واضح تصور دیا جارہا ہے کہ یہ خرچ بھی صدقہ ہے۔ اس پر اجر کی توقع کرنا چاہیے۔

☆ بلکہ اس صدقے کو اولیت حاصل ہے۔ یہ سب کرنے کے بعد' آدمی سوچے کہ اب کہاں خرچ کرنا ہے؟

☆ جب یہ تصور ہو گا کہ یہ صدقہ ہے' اور اس پر اجر ہے' تو ناجائز اور بے جا اخراجات کا راستہ خود بخود بند ہو جائے گا۔ اگر یہ شعور بیدار ہو' تو پھر آدمی کس طرح اپنی رقم اللہ کو ناراض کرنے والے کاموں میں خرچ کر سکتا ہے!

☆ مال کہاں خرچ کیا' کا سوال سب جانتے ہیں کہ پوچھا جائے گا۔ آمدنی کے حصے کر کے سب ضروری مدات پر خرچ کرنا چاہیے۔ جن نوجوانوں کی نئی آمدنی شروع ہو' انھیں شروع ہی سے اپنی رقم جواب دہی

کے احساس کے ساتھ خرچ کرنے کی عادت ڈالنا چاہیے۔

امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ مسئلے کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

۱۔ صدقہ اس آدمی کا بہتر ہے جس کی پشت مال دار ہو، جو آدمی صدقہ کرے در آں حالیکہ خود محتاج ہو یا اس کے اہل و عیال محتاج ہوں، تو اسے کہا جائے گا کہ پہلے اپنی حاجت پوری کرو۔

۲۔ ایک شخص کو دوسروں کا مال دینا ہو تو قرض کی ادائیگی، صدقہ دینے، غلام کو آزاد کرنے اور ہبہ کرنے کے مقابلے میں زیادہ ضروری ہے۔ ایسی صورت میں صدقہ اسے واپس لوٹا دیا جائے گا اور اسے کہا جائے گا کہ لوگوں کے قرض ادا کرو۔

کسی آدمی کو یہ حق نہیں دیا جا سکتا کہ لوگوں کے دیون ادا نہ کرے اور اس کی بجائے صدقہ کر کے ان اموال اور حقوق کو جو اس کی ذمہ داری ہیں، ضائع کر دے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو لوگوں کے مال تلف کرنے کی خاطر لیتا ہے یعنی لیتے وقت ان کی واپسی کا ارادہ نہیں رکھتا تھا تو اللہ تعالیٰ اس کے مال کو تلف کرے گا۔

۳۔ اگر ایک شخص خود حاجت مند ہو اور صدقہ کرتا ہو، اپنی حاجت پر صدقے کو مقدم رکھتا ہو، اور وہ حضرت ابوبکرؓ کی طرح صبر میں معروف ہو، دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتا ہو، اگرچہ خود بھوکا ہو جیسے کہ ابوبکر صدیقؓ نے کیا تھا جبکہ سارا مال صدقہ کر دیا تھا، یا جس طرح انصار نے مہاجرین کو ترجیح دی تھی تو ایسے لوگوں کا مسئلہ مختلف ہے۔ وہ اگر اپنی حاجت پر صدقے کو مقدم رکھیں تو اپنے جیسے لوگوں کے لیے قابلِ قدر اور قابلِ تقلید شمار ہوں گے۔ (بخاری، کتاب الزکوٰۃ، ج ۱، ص ۱۹۴)

○

حضرت عدیؓ بن حاتم سے روایت ہے کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھا تھا تو دو آدمی آ گئے۔ ایک بھوک کی شکایت کرنے لگا اور دوسرا ڈاکے کی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ڈاکے کے متعلق تو یہ سن لو کہ کچھ عرصے کے بعد ایسا وقت آنے والا ہے کہ ایک تجارتی قافلہ بغیر کسی محافظ کے غلہ لے کر مکہ جا رہا ہو گا۔ بھوک کے بارے میں سن لو کہ قیامت برپا نہ ہو گی یہاں تک کہ تم میں سے ایک آدمی اپنا صدقہ لے کر چکر کاٹتا پھرے گا، لیکن قبول کرنے والا کوئی نہ ملے گا۔ پھر تم میں سے ایک آدمی اللہ کے سامنے کھڑا ہو گا، دائیں طرف دیکھے گا تو آگ ہو گی، بائیں طرف دیکھے گا تو آگ ہو گی۔ پس اپنا بچاؤ کر لے تم میں سے ہر ایک آدمی آگ سے، اگرچہ کھجور کے ایک چھلکے کو صدقہ کر کے۔ اگر وہ بھی نہ ملے تو پاکیزہ بات کے ذریعے۔ (بخاری، ج ۱، ص ۱۹۰)

☆ غربت اور تنگ حالی، اور امن و امان کا نہ ہونا، آج بھی معاشرے کے اہم مسائل ہیں۔ عرب کے

معاشرے نے جب رسول اللہؐ کی تعلیمات کو اختیار کر لیا تو فارغ البال بھی ہو گئے اور امن و امان بھی قائم ہو گیا۔ آج بھی ان مسائل کا حقیقی حل یہی ہے کہ خود انسان میں تبدیلی آئے اور معاشرے کی تعمیر اللہ اور رسولؐ کے بتائے ہوئے طریقے پر کی جائے۔

☆ جو لوگ بھی دعوت دین کا کام کر رہے ہیں، انھیں اپنے مخاطبین دین کے اس عملی پہلو کی طرف توجہ دلانا چاہیے۔ یہ دنیاوی بات نہیں ہے، بالکل دینی بات ہے۔ خود اللہ کے رسولؐ نے اپنی کامیابی کو اس سے مربوط کیا اور پوچھنے والوں کو اطمینان دلایا۔

☆ صدقہ کا نہایت وسیع تصور دیا ہے۔ انسان یہ سوچتا رہ جائے کہ بڑی رقم ہو گی تو صدقہ کریں گے۔ معمولی رقم سے، حتیٰ کہ کھجور کے ایک چھلکے سے بھی صدقہ کا عمل ہو سکتا ہے اور انسان آگ سے بچ سکتا ہے۔ رقم ہونا سرے سے ضروری نہیں ہے۔ ضروری تو آگ سے بچنے کی فکر ہے۔

☆ صدقہ معاشرے کا معمول ہو گا تو غربت نہ رہے گی، آگ سے بچنے کی فکر ہو گی تو ڈاکے نہ رہیں گے۔

☆ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یقین دہانی پوری ہوئی۔ خلافت راشدہ کے دور میں امن و امان بھی قائم ہو گیا اور مالی فراوانی بھی لوگوں نے دیکھ لی۔ حضرت عثمانؓ کے دور میں اور پھر عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور میں یہ حال ہو گیا تھا کہ زکوٰۃ لینے والے نہ ملتے تھے۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ نے اپنے دور میں سونے چاندی اور درہم و دینار کی زکوٰۃ حکومتی سطح پر لینا بند کر دی اور لوگوں کو اجازت دے دی کہ خود ہی ادا کر دیا کریں۔ اس کے بعد سے اصول بن گیا کہ اموال باطنہ کی زکوٰۃ لوگ خود ادا کیا کریں گے۔

○

حضرت بشیر بن الخصاصیہؓ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور بیعت کرنے کے لیے حاضر ہوا۔ آپؐ نے مجھ پر یہ شرائط عائد کیں۔ ۱۔ اس بات کی شہادت دوں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور یہ کہ محمد اس کے بندے اور رسول ہیں۔ ۲۔ نماز قائم کروں۔ ۳۔ زکوٰۃ ادا کروں اور ۴۔ اسلام کی رو سے فرض ہونے والے حج کو ادا کروں۔ ۵۔ رمضان کے روزے رکھوں اور ۶۔ فی سبیل اللہ جہاد کروں۔

میں نے عرض کیا: یارسول اللہؐ! اللہ کی قسم، دو چیزوں یعنی جہاد اور صدقہ کی میں طاقت نہیں رکھتا۔

اس پر آپؐ نے اپنا ہاتھ بند کر کے روک لیا، پھر اسے کھولا اور حرکت دی اور فرمایا کہ جہاد نہیں، صدقہ نہیں تو جنت میں کیسے داخل ہو گے؟

میں نے عرض کیا: یارسول اللہؐ! تب میں اسی حال میں بیعت کرتا ہوں۔ چنانچہ میں نے ان ساری چیزوں پر بیعت کی۔ (مسند احمد)

☆ ہم بھی رسول اللہؐ پر ایمان لائے ہیں۔ اپنے دلوں کو ٹٹولیں اور دیکھیں کہ جہاد اور صدقہ کے بارے میں کیا کیفیت ہے؟

☆ صدقہ اور جہاد سے احتراز کریں اور جنت میں بھی داخل ہونا چاہیں! رسولؐ اللہ نے تو ہاتھ واپس کھینچ لیا تھا۔

☆ محاذ جنگ نہ ہو، تب بھی محاذ جنگ کی تمنا اور آرزو اور اس کے لیے آمادگی، جہاد کرنے والوں میں شامل کرا دے گی۔

☆ صدقہ کے لیے دل کو ہمیشہ کھلا رکھنا چاہیے۔ دین کے کاموں کے لیے، اجتماعی جدوجہد کے لیے کھلے ہاتھ سے انفاق کرنا چاہیے۔ یہ عمل دنیا میں بھی اطمینان قلب، پریشانیوں سے نجات اور خوشحالی عطا کرے گا۔

○

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو چاہتا ہو کہ اس کی دعا قبول کی جائے، اس کی بے چینی دور کر دی جائے، تو وہ تنگ حال کی مشکل حل کر دے۔ (مسند احمد)

☆ کون نہیں چاہتا کہ اس کی دعا قبول کی جائے، وہ مستجاب الدعوات ہو جائے۔ اللہ کے رسولؐ نے کتنا آسان نسخہ بتا دیا ہے۔

☆ ہر ایک کو ایسے تنگ حال افراد سے واسطہ پڑتا ہے جن کی مشکل وہ دور کر سکتا ہے۔ اس موقع پر مثبت رویہ اختیار کرنا چاہیے اور جو ممکن ہو وہ ضرور کر دینا چاہیے۔ تب ہی اللہ سے دعا کی قبولیت کی توقع کرنا چاہیے۔

☆ اپنی پریشانی کے وقت بھی صدقہ دینا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ پریشانی دور کر دیتے ہیں۔

○

حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمام دیناروں میں سے افضل دینار وہ ہے جسے آدمی اپنے اہل و عیال پر خرچ کرے۔ پھر وہ دینار ہے جسے اپنے اس گھوڑے پر خرچ کرے جو جہاد کے لیے رکھا گیا ہے۔ پھر وہ دینار ہے جسے مجاہد اپنے ان دوستوں پر خرچ کرتا ہے جو جہاد فی سبیل اللہ میں اس کے ساتھ ہیں۔ (مسلم)

☆ رقم خرچ کرتے ہوئے انسان کو فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ کس چیز کو کس پر ترجیح دے۔ اہل و عیال پر خرچ دینی نقطہ نظر سے اولیں اہمیت رکھتا ہے۔ گھر صحیح حال میں ہو گا تو انسان باقی سب کام دلجمعی سے کر سکے گا۔

☆ جہاد کی تیاری کے لیے بھی مال میں سے حصہ نکالنا چاہیے۔

☆ جہاد فی سبیل اللہ کے ساتھیوں اور دوستوں پر خرچ، ان کے ساتھ کھانا پینا، تحفہ تحائف دینا، ضرورت پوری کر دینا، یہ بھی مال کے بہترین استعمال میں سے ہے۔

☆ یہ سب خرچ آخرت میں نامہ اعمال میں اپنا وزن رکھیں گے۔

لمحہ فیصل

مسجد قبا میں پہلا خطبہ

ڈاکٹر اعجاز فاروق اکرم

یہ یثرب سے تین میل ادھر بنو سالم کی بستی ہے۔ تاریخ اسلام کا نیا اور کلیدی موڑ!

نبوت کے بارھویں اور ہجرت کے پہلے سال کا ربیع الاول' فی الواقع بہاروں اور نئی رتوں کا پیغام بر ہے۔ ہر طرف مسرت و شادمانی' زندگی' روشنی اور نور کا سماں ہے! یہ تاریخ ساز منظر ہے' ایک نیا آفتاب طلوع ہو رہا ہے۔

لاکھ ستارے ہر طرف' ظلمت شب جہاں جہاں   اک طلوع آفتاب دشت و چمن سحر سحر

یثرب اب یثرب نہیں رہا۔ مدینۃ النبیؐ بن گیا ہے۔ اک انقلاب آ رہا ہے۔ دائمی انقلاب آ رہا ہے!!

قوت و طاقت' حکومت و اقتدار' عظمت و کبریائی' جسم و جان' روح و فکر' قلب و نظر' زمین و زماں' مکین و مکاں' زندگی کا مقصود و مطلوب' معیار بندہ و آقا' عمل کے زاویے' سب بدل رہے ہیں۔ ذروں کے مقدر چمک رہے ہیں۔ کانٹوں کو گلوں کی قیمت عطا ہو رہی ہے۔ اونٹوں کے چرانے والے دنیا کی سیادت و قیادت پر فائز اور تہذیب و تمدن کے علم بردار بن رہے ہیں! بلاشبہ یہ انقلاب آفریں لمحہ ہے!!

ہجرت کے سفر میں قبا' ایک نئی اسلامی سلطنت کی دہلیز بن گئی ہے!

حیات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ لمحہ' لمحہ فیصل بھی ہے!

نئی اسلامی سلطنت میں داخل ہونے سے پہلے نئے نظام اور نئے ورلڈ آرڈر کا چارٹر عطا ہو رہا ہے' یہ نئی فکر اور نئے تصور حیات کا نقطہ آغاز ہے! یہ تَمَکن فِی الاَرض کا لمحہ ہے۔ یہ **کَلِمَۃُ اللّٰہِ ھِیَ الْعُلْیَا** کا پرچم سربلند ہونے سے قبل طاغوت کے سارے جھنڈے سرنگوں کرنے کا تاریخ ساز منظر ہے!

تاریخ اسلام کا پہلا جمعۃ المبارک' قبا و مدینہ کا درمیانی مقام' بنی سالم بن عوف کی بستی' سفر ہجرت کا اختتام اور ہجرت کے مقتضا و مدعا کا آغاز ہے۔ ظلم و ستم اور مقہوری و مجبوری کا دور ختم ہوا' نیا باب رقم ہونے چلا ہے!

پیغام اور دعوت وہی ہے، جو مکہ کی گلیوں، صفا و مروہ کی پہاڑیوں، طائف کے بازاروں، عکاظ کے میلوں اور دار ارقم میں دیا گیا۔ مگر اب زمان و مکان بدل گئے تو لہجہ بھی بدل گیا۔ پہلے محض ترغیب و ترہیب تھی، اب تائید ایزدی بھی حاصل ہے اور قوت بازو بھی۔ یہی لمحہ فتنہ کی بیخ کنی کے آغاز کا ہے، اللہ کا کلمہ اب بزور قوت نافذ ہو رہا ہے۔ یہ لمحہ طاغوت کے لیے اعلان موت ہے۔

کائنات کے آقا، مالک و معبود حقیقی کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا ہی عبدیت کا تقاضا اور تخلیق کائنات کا مقصود ہے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ (الذاریات ۵۱:۵۶)۔ یہی وہ پہلا نکتہ ہے جو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے جمعہ اور پہلے خطبہ کی سعادت کے طالب پروانوں کے ہجوم میں ارشاد فرمایا۔ اللہ پر مکمل اور غیر متزلزل ایمان، اس کی نافرمانی سے انکار، اس کے نافرمانوں سے کھلی جنگ!!

بندے کی یہ کیسی جرات کہ اپنے ہی مالک و خالق کے مقابل آ کھڑا ہو! نفس و شیطان اور حرص و ہوا کو معبود بنا لے، اپنی خود ساختہ سیاسی و معاشی مجبوریوں کی آڑ لے کر خدا کے دشمنوں سے دوستی قائم کرے۔ لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓی اَوْلِیَآءَ (المائدہ ۵:۵۱)، اور ہر شب اپنے اس اقرار وَنَخْلَعُ وَنَتْرُکُ مَنْ یَّفْجُرُکَ کے بعد خدا کے دشمنوں سے دوستی بلکہ ان کی غلامی کے طرز عمل سے اللہ کے غضب کو دعوت دے۔

اس بصیرت افروز خطبے کا دوسرا نکتہ توحید و رسالت ہے!

توحید --- یعنی اللہ کے سوا ہر خدائی سے انکار --- سنگ و خشت، رسوم و رواج، جاہ و حشم، قوت و دولت، فکر و تخیل کے خدا، معبود نہیں، گمراہی کے راستے ہیں۔

معبود تو فقط ایک --- لا الٰہ الا اللہ، عظمت و اقتدار اور حکم و اختیار بھی فقط اسی کا --- لَهٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (الحدید ۵۷:۵) اور اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (الاعراف ۷:۵۴)، وہی بڑا اور حمد و ثنا کا سزاوار --- اللہ اکبر وللہ الحمد!

رسالت کے بغیر معبود کی پہچان، اس کی عبادت، اس سے رابطہ، معبود کی حیثیت کا حقیقی شعور و ادراک، سب کچھ ناممکن ہے۔ رسولؐ کی اطاعت اللہ کی اطاعت، اس کی پیروی اللہ کی پیروی، اس کی رضا معبود کی رضا۔ اس کا ہر قول و فعل، حکم و فرمان، آقا کا حکم و فرمان، شریعت کا کلیہ و قاعدہ اور مقصود و مدعا۔ رسول ہی خدا کا نمائندہ، وہی مرشد، وہی قائد اور وہی راہبر و راہنما۔ مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (النساء ۴:۸۰)

اس انقلاب آفریں خطبے کا تیسرا نکتہ حقیقی علم کا تعین ہے، جو شریعت کا علم ہے! رسالت کی راہنمائی حاصل نہ ہو تو علم، علم نہیں جہل ہے اور سراسر اندھیرا ہے۔ تمیز بندہ و آقا کا شعور، معبود و مسجود کی معرفت، مالک کے حکم سے آگاہی، اس کی مشیت کی خبر، اس کی رضا کا علم، اس کا خوف اور عارضی و ابدی زندگی کا فرق جان لینا اور اس کے مطابق عمل کی راہوں کا تعین ہی سچا علم ہے۔ آقا کے حکم کو جان کر مان لینا اور بجا لانا ہی دانائی، بلکہ دانائی کا سرچشمہ ہے۔ معرفت رب کی روشنیوں میں اپنے مقام و مرتبہ سے آگاہی اور اپنے

انجام کار کو پیش نظر رکھ کر زاد سفر اکٹھا کرنا ہی حقیقی علم ہے۔ اس کے سوا سب جہالت، سب نادانی اور پستی ہی پستی ہے!!

قبا کے مقام پر جاری ہونے والے چارٹر کا چوتھا اور کلیدی نکتہ اتقوا اللہ حق تقاتہ تھا۔ آنحضور علیہ الصلوۃ والتسلیمات نے اس خطبہ میں تقویٰ کا ذکر پانچ یا اس سے زائد بار فرمایا۔ ارشاد ہوا: تقویٰ چہرے کو درخشاں بناتا ہے، پروردگار کو خوش کرتا اور درجات کو بلند کرتا ہے۔

تقویٰ درحقیقت اسلامی احکام کی روح، اس کی غایت اور تعلیمات نبویؐ کا خلاصہ ہے۔ یہی توشہ آخرت، مومن کے چہرے کی بشاشت اور آقا کی رحمت و محبت پالینے کا ذریعہ ہے۔

اللہ کی محبت، معیت، قبولیت اور کامیابی کا پروانہ بھی ہے۔ وَتَزَوَّدُوا فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی (البقرہ ۲:۱۹۷)، وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ (التوبہ ۹:۳۶)، اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ (التوبہ ۹:۷)، اِنَّ لِلْمُتَّقِیْنَ لَحُسْنَ مَاٰبٍ (ص ۳۸:۴۹)، اِنَّ لِلْمُتَّقِیْنَ مَفَازًا (النباء ۷۸:۳۱)۔

تقویٰ کیا ہے؟

تقویٰ دراصل وہ احساس ہے جس کی بنا پر خدا کی حضوری پیش نظر رہے اور ہر کام میں اسی کی رضا مقصود و مطلوب بن جائے۔ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (الانعام ۶:۱۶۲)۔

تقویٰ --- وہ جذبہ ہے، جو نیکیوں کا محرک بنے اور بدی سے متنفر کر دے۔

تقویٰ --- کارزار حیات میں دامن بچا بچا کر چلنے کا نام ہے۔

تقویٰ ہی معیار فضیلت و عظمت ہے۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (الحجرات ۴۹:۱۳)۔

اسلام کے نظام عبادات نماز، روزہ، زکوٰۃ، قربانی، نظام اخلاق، عدل و انصاف، عفو و درگزر، صبر و استقلال، استقامت و عزیمت، اصلاح احوال، امور حسنہ سب میں تقویٰ ہی کی روح کارفرما ہے۔

تقویٰ کی نصیحت ہی ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان کے لیے بہترین تحفہ ہے۔

تقویٰ ہی انجام کار ہے اور اچھی عاقبت بھی تو صرف متقین کی ہے۔

وَالْعَاقِبَۃُ لِلتَّقْوٰی (طٰہٰ ۲۰:۱۳۲)، وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ (الاعراف ۷:۱۲۸)۔

اہل تقویٰ وہ ہیں جو زندگی کے ہر موڑ پر سچائی، خدا خوفی اور اس کی اطاعت کا دامن تھام لیں۔ اس کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دیں، اس کی خاطر ہر مصیبت سہ لیں، دولت و جاہ اور ہر فانی چیز سے محروم ہو جائیں۔ اللہ، آخرت، کتاب اور رسولوں پر ایمان کے ساتھ شدید ضرورتوں اور حاجتوں کے باوجود اپنا مال راہ خدا میں لٹا دیں۔ اقامت صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ، عہد کی پاسداری، تنگی و ترشی میں صبر و استقامت اور راضی برضا کا طرز عمل اور رویہ رکھنے والے ہی متقی ہیں۔

لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ..... اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا ۔ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ (البقرہ ۲:۱۷۷)

تقویٰ مسجد کی دیواروں، تسبیح کے دانوں اور ماتھے کے محرابوں میں نہیں۔ تقویٰ تو دل کے اندر ہے۔ التقوی ھاھنا۔ تقویٰ کے لیے فقط اقرار، باللسان ہی کافی نہیں، تصدیق بالقلب بھی مطلوب ہے۔ ؎

دل و نگاہ مسلماں نہیں، تو کچھ بھی نہیں!!

اسلامی سلطنت کے پہلے حکمران کے پہلے فرمان عام کا چوتھا نکتہ خذوا بحظکم ولا تفرطوا فی جنب اللّٰہ تھا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ سلم نے اہل ایمان کو ہدایت فرمائی کہ دنیا سے خوب استفادہ کرو، عہد جدید کے تمام جائز تقاضے نہ صرف پورے کرو، بلکہ اس کی ہواؤں کا رخ اپنے عقیدہ و ایمان کی جانب موڑ کر انھیں اپنے دین و ایمان اور مرضات اللہ کے تابع کر دو! نئے دور کے چیلنجوں کا مقابلہ کرو، دور جدید کے ہر سازو سامان اور تکنیک سے آراستہ و باخبر رہو۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ (الانفال ۸:۶۰)۔

دنیا کے ہم سفر رہو، کسی سے پیچھے نہ رہو مگر اس طرح کہ یہاں دل نہ لگنے پائے، کن فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیل، نہ ہی دنیا کا مال و متاع یاد خدا سے غافل کر دے۔ لَا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (النور ۲۴:۳۷)، نہ ہی حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی میں کوتاہی ہونے پائے۔ نہ ہی ترک دنیا اور گوشہ نشینی اختیار کر کے زمام کار اللہ کے دشمنوں کے لیے چھوڑ دو۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تاریخ ساز خطبہ میں یہ پیغام بھی دیا کہ وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ (الحج ۲۲:۷۸)، اللہ کی راہ میں مسلسل جدوجہد کہ زندگی جہد مسلسل کی تصویر بن جائے۔ باہر کے شیطان سے نمٹ لو تو اندر کے شیطان پر قابو پاؤ۔ دین کی اشاعت، اعلائے کلمتہ اللہ کا فریضہ، امت وسط اور خیر امہ کا منصب، جہاد ہی کے تقاضے ہیں۔

خطبے کے آخر میں اعلان فرمایا: لوگو! تم چاہو یا نہ چاہو، اللہ کا حکم تو نافذ و غالب ہو کر رہے گا۔ بندۂ بے اختیار، باطل، کمزور اور فانی ہے، انسانوں پر انسانوں کا حکم اللہ کی حدود سے تجاوز ہے۔ بندہ اپنے مقام کو نہ بھولے، اپنی حیثیت کو فراموش نہ کرے، اپنی حدود سے تجاوز نہ کرے، خود کو اور اپنے آقا کو پہچان لے: من عرف نفسہ فقد عرف ربہ--- اور پھر آقا کے حکم کی تعمیل میں لگ جائے!!

آنحضور علیہ السلام کا یہ خطبہ نہ تو کسی خاص زماں کا پابند تھا، نہ کسی مخصوص مکاں تک محدود، نہ ہی فصل گل و لالہ کا رہین۔ یہ تو ایک دائمی نشان منزل ہے، نشان ہدایت ہے، اسوۂ عمل ہے، کل بھی اور آج بھی!

آج امت مسلمہ کا المیہ بھی یہی ہے کہ آج کا مسلمان اس ابدی اور لافانی پیغام کو کتابوں کے صفحات پر محفوظ کر کے بھول گیا ہے۔ ہدایت کا راستہ چھوڑ بیٹھا ہے۔ اللہ کا دشمن اب اس کا دوست ہے۔ کھلا عدو اب اس کا رازداں اور ہمدم و ہم ساز ہے۔ دنیا کے لہو و لعب، زینت و تفاخر، مال و متاع، اس کے معبود اور مقصود

حیات بن گئے ہیں۔ نفس و شیطان کا غلام، حرص و ہوس کا بندہ، مال و اولاد، رنگ، نسل اور زبان، اعزہ و اقربا کے رشتوں میں گرفتار اور انھیں خدا سے بڑھ کر محبوب اور عزیز رکھنے والا ہو گیا ہے۔ اب وہ نہ تو اپنے مسلماں بھائی کو جسد واحد کی طرح سمجھتا ہے، نہ اس کا درد اور دکھ محسوس کرتا ہے، نہ اس کی حاجت روائی کرتا ہے، نہ نصرت و اعانت۔ نہ اس کی آبرو اور عزت اور نہ ہی خون و جان کا محافظ ہے، نہ ان کا احترام کرتا ہے۔ آج کا مسلمان اپنے مسلمان بھائی کے ہاتھ اور زبان سے نہ تو محفوظ ہے نہ مامون۔ نہ اسے عیش میں یاد خدا رہتی ہے، نہ طیش میں خوف خدا دامن گیر ہوتا ہے۔

ہاں! آقائے دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیدت کے دعوے بلند بانگ، محبت کے بے شمار مظاہر، ارشادات نبویؐ سر آنکھوں پر، گیسوؤں اور زلفوں کا تذکرہ زبانوں پر۔ مگر آپؐ کی دعوت و پیغام صرف خوب صورت کتابوں کے صفحات پر۔ دل کا صفحہ اس سے محروم، کتاب زندگی اس سے عاری!! حیف صد حیف!

آج کے مسلمان کے فکر و نگاہ کے زاویے بدل گئے، دین و دنیا جدا ہو گئے، مسجد و محراب اور مسند اقتدار و سیاست کے راستے بدل گئے اور باقی فقط چنگیزی رہ گئی!

آج کا دور ـــــ مسلمان کے لیے لمحہ فیصل ہے!

اسلام کو تو بہرصورت غالب آنا ہی ہے۔ مگر یہ فیصلہ مسلمان کو خود کرنا ہے کہ احیاے اسلام اور امت مسلمہ کی نشاۃ ثانیہ کے اس مرحلے اور عہد میں، وہ اپنے لیے کس مقام کا انتخاب کرتا ہے! یہی تو وہ وقت ہے جب اللہ سچے اور جھوٹے گفتار اور کردار کے غازی الگ کر لے گا۔

فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ (العنکبوت ۲۹:۳)

دور اول کے مسلمان نے ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سنا اور سر تسلیم خم کر دیا۔

خطبہ جمعہ ختم ہوا، تاریخ کا سفر آگے بڑھا، ہجرت کا قافلہ سوئے منزل رواں ہوا۔ مکہ کے تیرہ سالوں کی طرح مدینہ میں آنحضور علیہ الصلوۃ والسلام کی صدا، صدا بصحرا ثابت نہ ہوئی۔ دیوانوں، پروانوں، مستانوں، فرزانوں نے سنا اور دل و جاں سے قبول کیا۔ مدینہ کی گلیوں میں خیر مقدم کے، اعلان حق تسلیم کیے جانے کے اور حق کے غلبے کے ترانے گونجنے لگے!

طلع البدر علینا من ثنیات الوداع
وجب الشکر علینا ما دعا للہ داع
ایھا المبعوث فینا جئت بالامر المطاع
جئت شرفت المدینۃ مرحبا یا خیر داع

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:
اللہ تعالٰی فرماتا ہے: "تو میرے محتاج بندوں پر اور دین کے کام کو آگے بڑھانے کے لیے خرچ کر' میں تجھ پر خرچ کروں گا"۔
(مسلم' بخاری)

قانون توہین رسالتؐ اور انسانی حقوق

محمد عطاء اللہ صدیقی

امریکی وزارت خارجہ کی ایک رپورٹ میں دنیا کے مختلف علاقوں میں عیسائی اقلیت کی حالت بیان کی گئی ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ پاکستان میں غیر مسلموں کو 'اپنا مذہب تبدیل کرنے کی اجازت ہے' لیکن مسلمانوں کا کوئی دوسرا مذہب اختیار کرنا غیر قانونی ہے۔ پاکستان کا سرکاری مذہب اسلام ہے۔ ۱۹۸۶ میں ۲۹۵۔سی قانون متعارف کرایا گیا جس کے تحت توہین رسالتؐ کی سزا موت مقرر کی گئی۔ امریکہ نے بار بار پاکستان حکومت سے توہین رسالتؐ قانون منسوخ کرنے کے لیے کہا ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ کئی بار دیکھنے میں آیا ہے کہ غیر مسلموں سے کوئی زیادتی ہوئی تو پولیس ذمہ داروں کو سزا دینے میں ناکام رہی۔ اس سے غیر مسلموں میں سخت مایوسی پھیلی ہے۔

امریکی حکومت کے اس ناروا اور اشتعال انگیز مطالبے پر سخت ردعمل کا اظہار کیا گیا ہے۔ پاکستان کی رائے عامہ نے اسے پاکستان کے داخلی معاملات میں مداخلت اور قومی خودداری پر ڈاکہ ڈالنے کے مترادف قرار دیا ہے۔ رائے عامہ کے راہنماؤں نے حکومت کو خبردار کیا ہے کہ مسلمان اپنے نبی اکرمؐ سے بے پناہ عشق اور محبت کرتے ہیں اور آپؐ کی ناموس پر حملے کو کسی صورت برداشت نہیں کریں گے۔

یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ امریکہ کی طرف سے حکومت پاکستان کو قانون توہین رسالتؐ کو ختم کرنے کے لیے دباؤ ڈالا گیا ہے۔ گذشتہ کئی برسوں سے امریکہ کے علاوہ انسانی حقوق کی مغربی تنظیمیں' ایمنسٹی انٹرنیشنل' دیگر ادارے اور مغربی ذرائع ابلاغ اس قانون کو تبدیل کرانے یا بے اثر بنانے کے لیے دباؤ ڈالتے رہے ہیں۔ پاکستان مسلسل ان کے یک طرفہ جارحانہ پراپیگنڈے کا شکار رہا ہے۔ ۱۹۹۵ میں جب رحمت مسیح اور سلامت مسیح کیس سامنے آیا تو مغرب کی طرف سے مذکورہ قانون کی مخالفت میں شدید پراپیگنڈہ کیا گیا۔ ابھی یہ مقدمہ چل ہی رہا تھا کہ جرمنی کے چانسلر ہلمٹ کوہل پاکستان کے دورے پر آئے۔ پاکستان کی سرزمین پر قدم رنجہ فرمانے کے بعد پہلا مطالبہ انہوں نے یہی کیا کہ حکومت پاکستان توہین رسالتؐ کے قانون کو ختم کرے۔ پاکستان میں انسانی حقوق کے نام نہاد مٹھی بھر علم برداروں کی طرف سے بھی خاصا واویلا کیا گیا۔ ایمنسٹی

انٹرنیشنل گذشتہ کئی برسوں سے اپنی سالانہ رپورٹوں میں اس مسئلے کو مسلسل اچھال رہا ہے۔
مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان اسباب و عوامل کا معروضی جائزہ لیا جائے جو امریکہ اور مغربی لابی کے اس پر اصرار مطالبے کا باعث بنے ہیں:

۱- مغربی تہذیب کا اصل سرچشمہ مجرد عقلیت اور الہامی تعلیمات کی مجنونانہ مخالفت کی بنیاد پر برپا کی جانے والی سیکولر ازم کی تحریک ہے۔ گذشتہ پانچ سو برسوں میں مغرب کی اجتماعی نفسیات کے دھارے کچھ اس طرح تشکیل پائے ہیں کہ اس میں مذہب کی مخالفت کا فطری داعیہ پیدا ہو گیا ہے۔

۲- کلیسا کو فکری محاذ پر شکست دینے کے بعد مغربی دانشور مذہبی سکالر کو اپنا حریف سمجھتا آیا ہے۔

۳- امریکہ و یورپ کی حد تک مغربی دانشور مذہب مخالف رویوں کا حامل نظر آتا ہے۔ وہ ابھی تک مغرب اور اسلام کے تعلقات کو صلیبی جنگوں کے تناظر میں ہی دیکھتا ہے۔

۴- اٹھارہویں انیسویں صدی کا مغربی دانشور فکری برتری کے گھمنڈ میں مبتلا رہا ہے۔ وہ اسلام کو مغلوب اور غلام اقوام کا مذہب قرار دیتا رہا ہے لیکن بیسویں صدی کے اختتام پر امریکہ اور یورپ میں کثیر تعداد میں اہل مغرب کی اسلام میں دلچسپی نے وہاں کے متعصب و مغرور طبقے کو سخت بوکھلاہٹ اور جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیا ہے۔ اسلام کی بڑھتی ہوئی پذیرائی کو روکنے کے لیے اسلام کے خلاف جارحانہ پراپیگنڈے کا سلسلہ شروع کر دیا گیا ہے۔

۵- سوشلزم کے سیاسی زوال کے بعد مغربی اقوام نے اپنا نیا ہدف اسلام کو بنا لیا ہے۔ سابق امریکی صدر رچرڈ نکسن نے نیٹو کو برقرار رکھنے کے جواز کے لیے اسلامی خطرے کی نشان دہی کی تھی۔

۶- مسلمانوں کو اپنے فکری تشخص سے محروم کرنا اور انھیں مغرب کے سیکولر فکری دھارے میں شامل کرنا مغرب کا اہم ترین ایجنڈا ہے۔ مغربی ذرائع ابلاغ کا مسلم ممالک تک پہنچنا اور عالمی بستی کے تصور کا فروغ اس ایجنڈے کے اہداف کو حاصل کرنے کی حکمت عملی کا حصہ ہے۔ مسلمانوں کو فکری و نظریاتی اساس سے محروم کرنے کے لیے انھیں اسلام سے متنفر کرنا ضروری ہے۔ اس کی آسان ترین صورت یہ ہے کہ ان کے ذہنوں میں شارع اسلامؐ کے متعلق شکوک و شبہات پیدا کیے جائیں۔ توہین رسالتؐ کے قانون کی مخالفت اسی پالیسی کی پیروی کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔

۷- مغربی لابی کے سرمائے سے چلنے والی انسانی حقوق کی نام نہاد تنظیمیں امریکہ اور یورپی ممالک کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے پاکستان میں اقلیتوں کے حقوق کی پامالی کو بڑھا چڑھا کر اور خوب نمک مرچ لگا کر بیان کرتی ہیں۔ ان کی طرف سے ارسال کردہ یہ مبالغہ آمیز رپورٹیں جب امریکہ اور یورپ میں پہنچتی ہیں تو وہاں تشویش کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ انسانی حقوق کی ان تنخواہ دار تنظیموں کا وجود اس طرح کی مبالغہ آمیز

رپورٹوں کا ہی مرہون منت ہے۔

۸۔ امریکہ اپنی سائنسی ترقی اور اقتصادی برتری کے نشے میں چور ہے، اس کی سوچ ایک ظالم استحصالی جاگیردار سے مختلف نہیں ہے، جو اپنے علاقے کے چھوٹے کاشتکاروں اور مزارعوں پر رعب داب قائم کرنے کو اپنا فطری استحقاق سمجھتا ہے۔ امریکی "سیکولر" ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن ان کا طرز عمل اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ پاکستان کے عیسائیوں کے حقوق کے تحفظ کو محض اس بنا پر اپنی ذمہ داری تصور کرتے ہیں کہ وہ ان کے ہم مذہب ہیں۔

امریکی وزارت خارجہ کی رپورٹ کا وہ حصہ بے حد تعجب انگیز ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ پاکستان میں بسنے والے عیسائی باشندے پولیس کے عدم تعاون کی وجہ سے سخت مایوسی اور عدم تحفظ کا شکار ہیں۔ جہاں تک پولیس کے رویے سے شکایت کی بات ہے، اس کا معاملہ صرف غیر مسلم اقلیتوں تک مخصوص نہیں ہے۔ پاکستان کے مسلم عوام کو بھی ان سے شدید شکایات ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ پاکستان میں مغربی لابی کے زیر اثر کام کرنے والی انسانی حقوق کی تنظیموں کا کردار مجموعی طور پر منفی رہا ہے۔ "شانتی نگر" کے واقعے کی جو جذباتی اور اشتعال انگیز تصویر کشی ان تنظیموں کے نمایندوں نے کی اسے افسوس ناک قرار دیا جا سکتا ہے۔ رحمت مسیح، سلامت مسیح کے مقدمے سے لے کر "شانتی نگر" کے افسوس ناک واقعے تک انھوں نے صورت حال کی یک طرفہ اور متعصبانہ تصویر کشی کر کے اسے سستی شہرت اور دولت کے حصول کا ذریعہ بنایا۔ انسانی حقوق کے یہ علم بردار ان واقعات کے متعلق مسخ شدہ حقائق کو فوراً ایمنسٹی انٹرنیشنل اور امریکہ میں انسانی حقوق کی تنظیموں کے نوٹس میں لے آتے ہیں۔ اس جانب دارانہ مخبری کا انھیں معقول معاوضہ دیا جاتا ہے۔۔۔ امریکہ کی وزارت خارجہ کی رپورٹ ہو یا ایمنسٹی انٹرنیشنل کی سالانہ رپورٹ، ان کے اعداد و شمار اور بیانات کا اصل سرچشمہ و ماخذ پاکستان میں انسانی حقوق کی تنظیموں کی رپورٹ ہی ہوتی ہے۔ یہ تنظیمیں پاکستان میں اقلیتوں کے حقوق کی مبینہ پامالی کے اکا دکا واقعات کو سنسنی خیز بنا کر تو پیش کرتی ہیں لیکن پاکستان میں اقلیتوں کو جو مراعات، سہولتیں اور عزت و احترام حاصل ہے، اس کا ذکر کبھی نہیں کرتیں جس سے امریکہ و یورپ میں پاکستان میں اقلیتوں کی صورت حال کے متعلق صحیح معلومات نہیں پہنچ پاتیں۔ انسانی حقوق کی تنظیموں کے اس منفی کردار کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان تنظیموں میں غیر مسلم (بالخصوص قادیانی) چھائے ہوئے ہیں۔

اس بات سے انکار ممکن نہیں ہے کہ کبھی کبھار مسیحی اقلیت کو پاکستان کی مسلم اکثریت کے ہاتھوں ناانصافی کا سامنا کرنا پڑا ہو، لیکن اگر مجموعی اعتبار سے پاکستان میں مسیحی برادری سے مسلمانوں کے برتاؤ اور انھیں ملنے والی مراعات کو پیش نظر رکھا جائے تو پاکستان کو کسی بھی مہذب ملک کے سامنے شرمندہ ہونے کی

رپورٹوں کا ہی مرہون منت ہے۔

۸۔ امریکہ اپنی سائنسی ترقی اور اقتصادی برتری کے نشے میں چور ہے، اس کی سوچ ایک ظالم استحصالی جاگیردار سے مختلف نہیں ہے، جو اپنے علاقے کے چھوٹے کاشتکاروں اور مزارعوں پر رعب داب قائم کرنے کو اپنا فطری استحقاق سمجھتا ہے۔ امریکی "سیکولر" ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن ان کا طرز عمل اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ پاکستان کے عیسائیوں کے حقوق کے تحفظ کو محض اس بنا پر اپنی ذمہ داری تصور کرتے ہیں کہ وہ ان کے ہم مذہب ہیں۔

امریکی وزارت خارجہ کی رپورٹ کا وہ حصہ بے حد تعجب انگیز ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ پاکستان میں بسنے والے عیسائی باشندے پولیس کے عدم تعاون کی وجہ سے سخت مایوسی اور عدم تحفظ کا شکار ہیں۔ جہاں تک پولیس کے رویے سے شکایت کی بات ہے، اس کا معاملہ صرف غیر مسلم اقلیتوں تک مخصوص نہیں ہے۔ پاکستان کے مسلم عوام کو بھی ان سے شدید شکایات ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ پاکستان میں مغربی لابی کے زیر اثر کام کرنے والی انسانی حقوق کی تنظیموں کا کردار مجموعی طور پر منفی رہا ہے۔ "شانتی نگر" کے واقعے کی جو جذباتی اور اشتعال انگیز تصویر کشی ان تنظیموں کے نمایندوں نے کی اسے افسوس ناک قرار دیا جا سکتا ہے۔ رحمت مسیح، سلامت مسیح کے مقدمے سے لے کر "شانتی نگر" کے افسوس ناک واقعے تک انھوں نے صورت حال کی یک طرفہ اور متعصبانہ تصویر کشی کر کے اسے سستی شہرت اور دولت کے حصول کا ذریعہ بنایا۔ انسانی حقوق کے یہ علم بردار ان واقعات کے متعلق مسخ شدہ حقائق کو فوراً ایمنسٹی انٹرنیشنل اور امریکہ میں انسانی حقوق کی تنظیموں کے نوٹس میں لے آتے ہیں۔ اس جانب دارانہ مخبری کا انھیں معقول معاوضہ دیا جاتا ہے--- امریکہ کی وزارت خارجہ کی رپورٹ ہو یا ایمنسٹی انٹرنیشنل کی سالانہ رپورٹ، ان کے اعداد و شمار اور بیانات کا اصل سرچشمہ و ماخذ پاکستان میں انسانی حقوق کی تنظیموں کی رپورٹ ہی ہوتی ہے۔ یہ تنظیمیں پاکستان میں اقلیتوں کے حقوق کی مبینہ پامالی کے اکا دکا واقعات کو سنسنی خیز بنا کر تو پیش کرتی ہیں لیکن پاکستان میں اقلیتوں کو جو مراعات، سہولتیں اور عزت و احترام حاصل ہے، اس کا ذکر کبھی نہیں کرتیں جس سے امریکہ و یورپ میں پاکستان میں اقلیتوں کی صورت حال کے متعلق صحیح معلومات نہیں پہنچ پاتیں۔ انسانی حقوق کی تنظیموں کے اس منفی کردار کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان تنظیموں میں غیر مسلم (بالخصوص قادیانی) چھائے ہوئے ہیں۔

اس بات سے انکار ممکن نہیں ہے کہ کبھی کبھار مسیحی اقلیت کو پاکستان کی مسلم اکثریت کے ہاتھوں ناانصافی کا سامنا کرنا پڑا ہو، لیکن اگر مجموعی اعتبار سے پاکستان میں مسیحی برادری سے مسلمانوں کے برتاؤ اور انھیں ملنے والی مراعات کو پیش نظر رکھا جائے تو پاکستان کو کسی بھی مہذب ملک کے سامنے شرمندہ ہونے کی

جس طرح حضور اکرمؐ کی تکریم بنی نوع انسان کی تکریم ہے' اسی طرح آپؐ کی توہین (معاذ اللہ) انسانیت کی توہین ہے۔ انسانیت کے عظیم ترین محسن کے حقوق کے تحفظ کی ضمانت کے بغیر انسانی حقوق کے کسی بھی چارٹر کی کوئی حیثیت نہیں۔

انسانی حقوق کے حوالے سے "آزادی ضمیر'' "آزادی عقیدہ" اور "آزادی رائے" جیسی اصطلاحات کا بہت کثرت سے استعمال کیا جاتا ہے۔ ان خوش کن تراکیب کی من مانی تعبیرات کے ذریعے اسلام اور شارع اسلامؐ پر ناروا تنقید کے جواز مہیا کیے جاتے ہیں۔ انسانی حقوق کے مذکورہ چارٹر کی دفعہ ۱۸ اور ۱۹ میں ان کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

"ہر شخص کو آزادی خیال' آزادی ضمیر اور آزادی مذہب کا حق حاصل ہے۔ اس حق میں اپنا مذہب اور عقیدہ تبدیل کرنے اور انفرادی و اجتماعی طور پر علیحدگی میں یا سب کے سامنے' اپنا مذہب یا عقیدے کی تعلیم' اس پر عمل کرنے' اس کے مطابق عبادت کرنے اور اس کی پابندی کرنے کی آزادی کا حق شامل ہے"۔ (شق نمبر۱۸)

"ہر شخص کو آزادی رائے اور آزادی اظہار کا حق حاصل ہے۔ اس حق میں بلامداخلت رائے رکھنے کی آزادی اور بلالحاظ علاقائی حدود کسی بھی ذریعے سے اطلاعات اور نظریات تلاش کرنے' حاصل کرنے اور انھیں دوسروں تک پہنچانے کی آزادی شامل ہے"۔ (شق نمبر۱۹)

مندرجہ بالا شقیں بہت واضح ہیں' ان کا کوئی بھی جملہ قانون توہین رسالتؐ سے متصادم یا متعارض نہیں ہے۔ پاکستان میں مسیحی برادری کو اپنے ضمیر اور مذہب کے اظہار کی مکمل آزادی ہے۔ "آزادی رائے" میں جہاں معقول اور صائب طریقے سے اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کی مکمل آزادی شامل ہے وہاں اس اصطلاح کے دائرہ کار میں کسی دوسرے انسان کی کردار کشی' گالی گلوچ' توہین' دل آزاری' سب و شتم ہرگز شامل نہیں ہے۔ جب "آزادی رائے" کے حق کو کسی دوسرے انسان کی تذلیل تک توسیع نہیں دی جا سکتی تو پھر اس کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے "توہین رسالتؐ" کے استحقاق کا دعویٰ کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ انسانی حقوق کے علم برداروں کے لیے یہ ایک کھلا چیلنج ہے کہ وہ ثابت کریں کہ قانون توہین رسالتؐ انسانی حقوق کے منافی آخر کس طرح ہے؟"

انسانی حقوق کا چارٹر ۱۹۴۸ء میں پیش کیا گیا۔ بعد میں جنیوا کنونشن وغیرہ بھی سامنے آئے۔ کسی بھی دستاویز میں توہین رسالتؐ کے خلاف سزا کو انسانی حقوق کے منافی قرار نہیں دیا گیا۔ درحقیقت Blasphemy (توہین رسالتؐ) اور انسانی حقوق کا ربط اس وقت جوڑا گیا جب شاتم رسول سلمان رشدی ملعون کی "شیطانی فقرے" پر امام خمینیؒ نے اس کے قتل کا فتویٰ دیا۔ سلمان رشدی نے اس سے پہلے بھی دو ناول تحریر کیے تھے

لیکن اس کو وہ پذیرائی نہ ملی تھی۔ لیکن اس کے شیطانی ناول کے حقوق پلک جھپکتے ہی کروڑوں میں بک گئے۔ اس ناول میں ملعون رشدی سے خیرا لبشرؐ کے منزہ وپاکیزہ گھرانے پر زہرافشانی کرائی گئی تھی۔ مغرب کی ایک مخصوص صیہونی و عیسائی لابی آج بھی پیغمبرؐ اسلام اور ان کے مقدس گھرانے کے خلاف گستاخانہ جسارتوں پر مریضانہ حظ اٹھاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے مغرب اپنی تمام تر روشن خیالی اور سیکولرازم سے وابستگی کے باوجود مسلمانوں کے خلاف صلیبی دور کا بغض اور کینہ اب تک پال رہا ہے۔ اسلام اور پیغمبرؐ اسلام کے خلاف توہین آمیز سازشوں کی نئی تحریک ننگ اسلام، بے دین "مسلمانوں" کے ذریعے سے برپا کی جا رہی ہے جس کے مہرے سلمان رشدی اور بنگلہ دیشی تسلیمہ نسرین جیسے لوگ ہیں۔ ان کی تمام تر شیطانی ہرزہ سرائیوں کو "انسانی حقوق" کا نام دے کر تحفظ دیا جا رہا ہے۔ "انسانی حقوق" کے لبادے میں مسلمانوں سے "شیطانی حقوق" کو تسلیم کرانے کی مہم زوروں پر ہے۔ "انسانی حقوق کے چارٹر" کو انسانیت کا "متفق علیہ مذہب" بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ مسلم دنیا کے خلاف نیا استعماری ہتھیار ہے جسے بے حد مکاری اور منافقت سے استعمال کیا جا رہا ہے۔

جہاں تک قانون توہین رسالتؐ پر دوسرے اعتراض کا تعلق ہے کہ اس کی بنیاد پر غلط مقدمات قائم کیے جا سکتے ہیں، تو یہ اعتراض اصولی طور پر غلط اور غیر منطقی ہے۔ اگر اس اعتراض کو درست مان لیا جائے تو "جرم و سزا" کی دنیا میں کسی بھی تعزیری ضابطے یا قانون کے وجود کا جواز باقی نہیں رہے گا۔ آج تک کسی بھی قانون کو محض اس بنا پر ختم نہیں کیا گیا کہ اس کے غلط استعمال ہونے کا احتمال پایا جاتا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ دنیا کا کوئی بھی اچھا قانون ایسا نہیں ہے کہ جس کے غلط استعمال ہونے کا احتمال نہ پایا جاتا ہو۔ قتل، زنا اور چوری جیسے سنگین جرائم کے متعلق قوانین کے غلط استعمال کی خبریں پاکستان اور دیگر ممالک کے حوالے سے آئے روز چھپتی رہتی ہیں۔ حال ہی میں مقصود نامی ایک بے گناہ نوجوان کو سپریم کورٹ کے حکم امتناعی کے ذریعے پھانسی لگنے سے صرف ۲۴ گھنٹے قبل بچایا گیا ہے۔ لیکن کسی نے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ پھانسی کے قانون ہی کو یکسر ختم کر دیا جائے کیونکہ اس کی وجہ سے ایک بے گناہ شخص پھانسی چڑھنے لگا تھا۔ کوئی بھی صاحب فہم و دانش شخص جرائم کی بیخ کنی کے مقصد کے تحت بنائے گئے قوانین کو محض اس بنا پر ختم کرنے کی حمایت نہیں کرے گا کہ بعض افراد اس کا ناجائز استعمال کرتے ہیں کیونکہ اس کا منطقی نتیجہ بھیانک انارکی اور لاقانونیت کی صورت میں سامنے آئے گا۔ کیا ہم استفسار کر سکتے ہیں کہ آخر کس عقلی دلیل اور استخراجی منطق کے تحت حکومت پاکستان سے قانون توہین رسالتؐ کو ختم کرنے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ انسانی حقوق کے بعض بدنصیب پرچارک یہ بھی مطالبہ کرتے ہیں کہ قانون توہین رسالتؐ میں سزائے موت کو ختم کر دیا جائے۔ لیکن ان کا یہ مطالبہ بھی درست نہیں ہے کیونکہ "توہین رسالت" کا جرم "انسانیت کے خلاف" جرم

ہے۔ بے حد افسوس کی بات ہے کہ وہ منشیات کی اسمگلنگ کو تو انسانیت کے خلاف جرم سمجھتے ہوئے اس کے لیے سزائے موت کو قابل اعراض نہیں سمجھتے لیکن "توہین رسالتؐ" کے قانون پر اعتراضات کی بوچھاڑ کرتے ہیں۔ درحقیقت انھیں مقام رسالتؐ کا صحیح ادراک و معرفت ہی نہیں ہے۔ وہ آفتاب نبوتؐ کی ضیا پاشیوں کو چھوڑ کر مغرب کے فکری ظلمت کدوں میں بھٹک رہے ہیں۔

پاکستان میں قانون توہین رسالتؐ کو برقرار رکھنا بے حد ضروری ہے کیونکہ:

۱۔ پاکستان کی ۹۷ فی صد آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے جو قرآن و سنت کو واحد ذریعہ نجات سمجھتے ہیں۔ قرآن و سنت کی رو سے توہین رسالتؐ کی سزا موت ہی ہے۔

۲۔ قانون توہین رسالتؐ مہذب دنیا میں مروج قانونی اقدار و روایات سے ہم آہنگ ہے۔ جب اعلیٰ عدالتوں کے جج صاحبان کی آبرو اور شخصیت کے تحفظ کے لیے "توہین عدالت" کے قوانین پوری دنیا میں درست تسلیم کیے جاتے ہیں تو پھر نوع انسانی کے سب سے بڑے محسنؐ کی ناموس و آبرو کے تحفظ کے لیے قانون توہین رسالتؐ کیوں نہیں ہو سکتا۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ اس دنیا کی بڑی سے بڑی عدالت کا جج محسن انسانیتؐ کے پائے اقدس کی خاک کے برابر بھی نہیں ہو سکتا۔ امریکہ اور یورپ کے قانونی نظام میں ایک عام فرد کی عزت نفس کا دفاع کرنے کے لیے "ازالہ حیثیت عرفی" کے قوانین شامل ہیں Defamation اور Libelاور Law of tort جیسے قانونی ڈھانچے موجود ہیں۔ جب ایک عام فرد کی عزت و ناموس کے لیے قوانین کے جواز کو تسلیم کیا گیا ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ وجہ تخلیق کائنات، محسن انسانیتؐ امام الانبیا، افضل البشر، ایک ارب ۲۰ کروڑ مسلمانوں کی آنکھوں کے نور اور دل کے سرور، محبوبؐ خدا کی عزت و ناموس کی حفاظت کے لیے قانون نہیں بنایا جا سکتا۔

۳۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق جناب رسالتمآبؐ اور تمام انبیاے کرام کا احترام مسلمانوں پر فرض ہے۔ کسی بھی نبی مکرم کی توہین و تحقیر کفر کا درجہ رکھتی ہے۔ قانون توہین رسالتؐ میں دیگر انبیا کی توہین بھی شامل ہے۔ گویا یہ قانون نبی آخر الزمانؐ کی عزت و ناموس کی حفاظت کے علاوہ حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور دیگر تمام انبیا کرام علیہم السلام کی آبرو کی حفاظت کا ضامن ہے۔

۴۔ بائبل اور انجیل کی مصدقہ روایات کی رو سے بھی توہین رسالتؐ کی سزا موت ہے، گویا قانون توہین رسالتؐ مسیحی عقائد کے بھی عین مطابق ہے۔

۵۔ یہ بات محض مفروضہ، ہیجان خیزی اور بے بنیاد خدشات پر مبنی ہے کہ قانون توہین رسالتؐ پاکستان کی غیر مسلم اقلیتوں پر ظلم و ستم ڈھانے کے لیے بنایا گیا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کا اطلاق مسلم و غیر مسلم سب گستاخان رسول پر ہوتا ہے۔ اس قانون کے تحت سلمان رشدی، تسلیمہ نسرین اور یوسف

کذاب جیسے مسلمانوں کے گھرانوں میں پیدا ہونے والے افراد کو بھی سزا دی جا سکتی ہے۔

۶- پاکستان کا آئین اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کی ضمانت دیتا ہے۔ پاکستان کی اعلیٰ عدالتوں نے اقلیتوں کے ساتھ ہمیشہ انصاف کیا ہے۔ قانون توہین رسالتؐ کی روشنی میں قائم کردہ مقدمات کی جانچ پڑتال اور ریکارڈ، شہادتوں کے تجزیے کے بعد ہی کسی ملزم کو سزا دی جا سکتی ہے۔ قانون توہین رسالتؐ ۱۹۸۶ میں معرض وجود میں آیا لیکن عملاً آج تک کسی بھی فرد کو اس قانون کی خلاف ورزی کی پاداش میں سزائے موت نہیں دی گئی۔ امریکی حکومت اور انسانی حقوق کی تنظیموں کا واویلا خود ساختہ مفروضات اور درپردہ مذموم عزائم کی پیروی پر مبنی ہے۔

۷- قانون توہین رسالتؐ کسی مارشل لا کے ضابطے کے تحت نہیں بنایا گیا۔ اسے تیرہ کروڑ مسلمانوں کے جمہوری نمایندوں پر مشتمل منتخب پارلیمنٹ نے باقاعدہ قانون سازی کے طریقہ کار کے مطابق منظور کیا ہے۔ پارلیمانی جمہوری نظام میں مقننہ کی بالادستی کے اصول کو تسلیم کیا جاتا ہے۔

۸- امریکہ یا کسی دوسری ریاست کو بین الاقوامی قانون اور بین الاقوامی تعلقات کے مسلمہ اصولوں کے مطابق پاکستان سے یہ مطالبہ کرنے کا حق حاصل نہیں ہے کہ وہ قانون توہین رسالتؐ کو ختم کر دے۔ یہ بات پاکستان کے بیرونی اقتدار اعلیٰ پر حملہ اور اس کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے کے مترادف ہے۔

۹- پاکستان میں بسنے والی مسیحی برادری کی غیر معمولی اکثریت مسلمانوں کے پیغمبر صادقؐ کا احترام کرتی ہے۔ وہ ہر اس بات سے احتراز کرتی ہے کہ جس سے توہین رسالتؐ یا مسلمانوں کی دل آزاری کا پہلو نکلتا ہو۔ لیکن تاریخ بتلاتی ہے کہ ہر دور میں مسیحیوں اور دیگر غیر مسلموں کی ایک قلیل تعداد توہین رسالتؐ کے جرم کا ارتکاب کرتی رہی ہے۔ یہ لوگ مذہبی جنونی تھے جنھیں ان کے اپنے ہم مذہبوں نے بھی قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ عالمی تناظر میں جس طرح اسلام اور مسلمانوں کے خلاف زہریلا پراپیگنڈہ کیا جا رہا ہے، اس کی روشنی میں یہ خدشہ بے جا نہیں ہے کہ اگر اس قانون کو ختم کر دیا جائے تو پاکستان میں بسنے والے کئی لوگ گستاخانہ جسارتوں پر مائل ہو سکتے ہیں۔

۱۰- عاصمہ جہانگیر ایڈووکیٹ کا انسانی حقوق کا کمیشن مسلسل یہ پراپیگنڈہ کر رہا ہے کہ قانون توہین رسالتؐ کے تحت قادیانیوں اور عیسائیوں کے خلاف قائم کیے جانے والے تمام مقدمات انتقام اور بدنیتی پر مبنی ہیں۔ دو چار مقدمات کے بارے میں تو ان خدشات کے درست ہونے کے امکان کو مسترد نہیں کیا جا سکتا لیکن تمام مقدمات کو بے بنیاد قرار دینا اتنا لغو الزام ہے کہ جس کی تردید کے لیے مفصل دلائل کی ضرورت نہیں ہے۔ صیہونی لابی کے زیر اثر ذرائع ابلاغ نے ہمیشہ اکثریت کے مقابلے میں اقلیت کو معصوم عن الخطا قرار دینے کی پالیسی کو فروغ دیا ہے۔ یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ پاکستان میں جب کبھی مسلمانوں اور غیر مسلموں

کے درمیان اختلاف کی صورت سامنے آئے گی، قصوروار مسلمان ہی ہوں گے۔ ان کے اس یک طرفہ پراپیگنڈے سے بہت سے شاتمان رسولؐ قانون کی گرفت سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

۱۱۔ مغربی صیہونی اسلام دشمن لابی نے گذشتہ چند برسوں میں شاتمان رسولؐ پر انعام و اکرام کی جس قدر بارش کی ہے، اس کو دیکھتے ہوئے قانون توہین رسالتؐ کا موثر نفاذ ضروری ہو گیا ہے۔ سلمان رشدی ملعون اپنے "شیطانی ہفوات" اور بعد میں دیے جانے والی انٹرویو کے بدلے میں دس کروڑ کے لگ بھگ رقم کھا چکا ہے۔ تسلیمہ نسرین جرمنی میں تعیش کی زندگی گزار رہی ہے۔ سلامت مسیح یورپ کی "جنتوں" کی سیر کر رہا ہے۔ اس طرح کے مادی فوائد بہت سے گمراہ نوجوانوں کو آزادی فکر کے نام پر توہین رسالتؐ کے جرم کے ارتکاب کی ترغیب دے سکتے ہیں۔

۱۲۔ جس طرح اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے موثر قوانین اور ان کے عملی نفاذ کی ضرورت ہے، بالکل اسی طرح اکثریت کے حقوق کے تحفظ کے لیے تحریری قوانین کی موجودگی بھی ضروری ہے۔ اکثریتی گروہ کی طرف سے رواداری اور تعاون بے حد ضروری ہے لیکن اقلیتی گروہ کو بھی اکثریت کے جذبات اور احساسات کا خیال رکھنا چاہیے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے توہین رسالتؐ نہایت نازک معاملہ ہے۔ ناموس رسالتؐ پر انھوں نے ہمیشہ جانیں قربان کی ہیں اور آیندہ بھی کریں گے۔ مغرب کے لیے بھی انسانی روش یہی ہے کہ وہ خود بھی اپنی سرزمین پر کسی بھی رسول کی توہین کو قابل تعزیر جرم قرار دے۔ مسلمانوں کو تو قرآن میں دوسروں کے خداؤں کو برا کہنے سے بھی منع کیا گیا ہے۔ دوسروں کو بھی اس پر عمل کرنا چاہیے کہ ہمارے معزز اور محترم انبیا کرام کی شان میں گستاخی نہ خود کریں اور نہ کرنے والوں کے سرپرست بن کر سامنے آئیں۔

مطالعہ کتب

افریقہ: غیر ملکی امداد کی تباہ کاریاں

مسلم سجاد

(ماہنامہ World & I' مئی ۹۷ میں مائیکل مارین (Michael Maren) کی کتاب: Road to Hell پر لکھا گئے' جارج آیے ٹی (George Ayittey) کے تبصرے: ہمدرد گدھ (Compassionate Vultures) پر مبنی)۔

افریقہ گذشتہ کئی برسوں سے بحران در بحران کا شکار ہے۔ معیشت تباہ ہو رہی ہے اور ریاستیں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں۔ قتل و غارت' بھوک اور قحط کے ناقابل یقین مناظر نظروں کے سامنے آتے ہیں تو ذہن میں سوال اٹھتا ہے کہ بے قصور عوام کو استعمار سے آزادی کے یہ کڑوے کسیلے پھل کیوں مل رہے ہیں؟ برونڈی' ایتھوپیا' لائبیریا' روانڈا' صومالیہ' زائرے' ہر جگہ ایک ہی کہانی ہے۔ لکھو کھا پناہ گزین' عورتوں اور بچوں کے ہجوم کے ہجوم' دربدر ہیں۔ ان کے ملکوں میں خانہ جنگی ہے' لوٹ مار ہے' انتشار ہے' ظلم ہے۔ ان کی مدد اور نجات کے لیے مغربی ممالک کی ریلیف ایجنسیاں میدان میں آجاتی ہیں۔ ذرائع ابلاغ سے خوف ناک دلوں کو ہلا دینے والی تصاویر دکھا کر امداد کی اپیلیں کی جاتی ہیں۔ ایک تصویر میں ایک بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ بچہ سڑک کے کنارے پڑا ہے' اس کے چہرے پر مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں اور قریب ہی چند گدھ اس کے مرنے کے انتظار میں چکر لگا رہے ہیں۔ لگتا ہے کہ یہ بچہ' افریقہ کے مصائب کی علامت ہے اور گدھ' مغربی این جی اوز' اجناس کے امریکی تاجر' اسلحہ کے بیوپاری' اور خیراتی ادارے ہیں۔ پناہ گزینوں کی مدد کرو' بھوکوں کو کھانا کھلاؤ کے نعرے' دراصل منافع خوروں کے حقیقی مقصد کو ڈھانکنے والے مقدس لبادے ہیں' فاقہ کشوں اور ضرورت مندوں کی اپنی حیثیت ثانوی ہے۔ ان کی تفصیلات پڑھ کر متلی ہونے لگتی ہے۔ جب مغربی کینیا کے علاقے ترکانا میں قحط کی صورت حال پیدا ہوئی تو کیتھولک ریلیف سروس کے ڈائرکٹر نے خوشی کا اظہار کیا کہ اب ہمارے لیے اپنا کام بڑھانے کا موقع ہے!

دراصل امریکہ کے کاشت کار' حکومت سے زر تلافی حاصل کر کے جو فاضل غلہ پیدا کر رہے ہیں' اسے تقسیم کرنے کے لیے حکومت امریکہ امدادی ایجنسیوں کو رقم دیتی ہے۔ جتنی زیادہ خوراک یہ تقسیم کرتے ہیں' اتنی ہی زیادہ رقم امریکی حکومت سے ملتی ہے۔

بیرونی امداد معاشی ترقی کے نام پر دی اور لی جاتی ہے، لیکن کیا اس سے فی الواقع معاشی ترقی ہوئی ہے؟ کینیا کے ایک سابق ممبر پارلیمنٹ، ڈیوڈ کارانجا کا کہنا ہے: "بیرونی امداد نے افریقہ کو اس سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے، جتنا ہم تسلیم کرتے ہیں۔ اس کی وجہ سے افریقہ، اپنی ترقی کی سمت اور رفتار کا فیصلہ اپنی ترجیحات کے مطابق نہیں کر سکا ہے۔ آج افریقہ کے ترقیاتی منصوبے ہزاروں میل دور ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف کے دفاتر میں تیار کیے جاتے ہیں۔ جہاں کے ماہرین افریقہ کی حقیقی صورت حال سے نابلد ہوتے ہیں" (نیو امریکن، جون ۹۴، ص ۲۰)۔

Road to Hell کا مصنف بتاتا ہے کہ بیرونی امداد کے منصوبوں میں کام کرنے والے امریکی عموماً اس کے جیسے ناکام شادیوں اور ٹوٹے ہوئے خاندانوں کے نوجوان ہوتے ہیں۔ وہ خود کچھ عرصے کینیا میں استاد رہا، پھر جب کیتھولک ریلیف سروس کو منصوبہ: "کام کے بدلے غذا" شروع کرنے کے لیے ۹ لاکھ ڈالر کی گرانٹ ملی تو وہ اس کا پراجیکٹ ڈائرکٹر بنا دیا گیا۔ وہ بتاتا ہے کہ وہ زراعت، جنگلات، سڑکوں کی تعمیر، کنووں کی کھدائی، ڈیم کی تعمیر کی الف ب بھی نہ جانتا تھا لیکن ان منصوبوں کی منظوری دیتا تھا۔

جتنی تفصیلات میں جائیں، صورت حال خوف ناک تر ہوتی جاتی ہے۔ سب سے زیادہ قابل نفرت تو فاقہ زدہ بچوں کو عطیات حاصل کرنے کے لیے استعمال کرنا ہے۔ امدادی کارروائیاں ایک صنعت کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں، جن میں مغربی خیراتی ادارے، غلے اور اسلحے کے تاجر اور امریکی قانون ساز مل بھگت کر کے منافع سمیٹتے ہیں۔

مارین کے مطابق: "یو ایس ایڈ کے ۸۰ فی صد ٹھیکے اور عطیات امریکی کمپنیوں کو دیے جاتے ہیں جو پھر انھیں ضرورت مند ممالک میں تقسیم کرتے ہیں۔ جب ایک ممبر کانگریس نے بیرونی امداد پر اعتراض کیا کہ یہ امریکی ٹیکس گزار کی رقم کو بیرونی چوہوں کے بل میں پھینکنے کے مترادف ہے تو یو ایس ایڈ کے ایک افسر نے جواب دیا: "یہ بل ان کا اپنا ڈسٹرکٹ بھی ہو سکتا ہے" (لاس اینجلز ٹائمز، اکتوبر ۹۵)۔

۱۹۹۳ میں امریکی این جی اوز کو یو ایس ایڈ سے ۹ء۱ ارب ڈالر ملے۔ ان رقومات کے سلسلے میں عموماً جواب دہی کا نظام نہیں ہوتا۔ نوکر شاہی کا پہلا اصول خود اپنے کو مضبوط کرنا ہوتا ہے، اس لیے رقومات کا بیشتر حصہ تنخواہوں اور کرایوں میں جاتا ہے۔ ایک خیراتی ادارے کے سربراہ کو ۲ لاکھ ڈالر معاوضہ اور ۲ ہزار ڈالر رہائشی الاؤنس دیے جاتے ہیں۔ ورلڈ بنک کے ایک سابق افسر کے مطابق: "بنک کے منصوبے عموماً سرکاری پروگرام کی حیثیت سے ہوتے ہیں جن میں چوری، رشوت اور کرپشن کے نت نئے طریقے رائج ہیں۔ نقد رقم سے کرپٹ حکمران طبقے کو تقویت ملتی ہے اور تباہ کن سوشلسٹ پالیسیاں جاری رہتی ہیں۔ اس طرح ورلڈ بنک دراصل کرپٹ، ظالم اور سفاک حکومتوں کا ساتھی بن جاتا ہے" (واشنگٹن ٹائمز، ۲۰ جون، ۱۹۹۵)۔

دوسری جنگ کے بعد امریکہ کا غلہ، مارشل پلان کے تحت یورپ گیا اور اس سے امریکی کاشت کاروں کے لیے خوش حالی کا دور آیا لیکن جب یورپ اپنی ضرورت خود پوری کرنے لگا تو اب فاضل غلے کا کیا ہو؟ افریقہ، ایشیا اور لاطینی امریکہ کے ممالک کے پاس غلہ خریدنے کے لیے ڈالر نہیں تھے، روپے اور نائرے وغیرہ تھے۔ اس مسئلے کا حل، امریکہ نے پبلک لا ۴۸۰ نکالا۔ اس کا مقصد خود ہی صاف بیان کیا گیا ہے:
"امریکہ کی خارجہ پالیسی کو آگے بڑھانے کے لیے فاضل زرعی اجناس کا زیادہ سے زیادہ موثر استعمال"۔

یہ طریق کار وضع کیا گیا کہ زرعی اجناس کی نجی تجارت ہو، اور مقامی کرنسی قبول کی جائے، حکومت امریکہ اس کے بدلے ڈالر فراہم کر دے اور مقامی کرنسی متعلقہ ممالک میں اپنے مقصد کے لیے استعمال کرے۔ جلد ہی پی ایل ۴۸۰، دودھ دینے والی گائے بن گیا۔ اس کو برقرار رکھنے کے لیے مضبوط لابی بن گئی۔ تاجر، این جی اوز اور ریلیف ایجنسیاں سب ہی کے مفادات اس سے وابستہ ہو گئے۔ اس کی حمایت میں تقریر کرتے ہوئے کانگریس کے ایک ممبر نے کہا کہ ہر ڈالر امریکہ کی معیشت کی بہتری پر صرف ہوتا ہے اور ٹیکس میں اضافہ کرتا ہے۔ امریکہ کی جہازراں کمپنیاں کیوں محروم رہتیں؟ ۱۹۹۲ میں کانگریس نے ایک ایکٹ منظور کیا جس کی رو سے ۷۵ فی صد اجناس امریکی جہاز ران کمپنیوں کے ذریعے جانا لازمی تھا۔ ان کے نرخ بازار سے ۲ سے ۳ گنا زائد تھے۔ اس کی وجہ سے کارگو کے اخراجات میں ۱۹۸۹ سے ۱۹۹۳ تک فی سال ۵۷۸ ملین ڈالر کا اضافہ ہوا۔ یعنی رقم واپس امریکہ پہنچنے لگی۔ مارین کے مطابق: "امریکی این جی اوز، فوج اور بحری دستوں کی طرح شروع سے امریکی خارجہ پالیسی کے آلات ہیں"۔

ان ماہرین سے اور اس امداد سے کینیا، صومالیہ، روانڈا اور زائرے کے شہریوں کو کیا حاصل ہوا؟ "مفت غلہ ٹنوں کے حساب سے آیا تو مقامی کاشت کار اپنے کام سے گئے۔ چند ہی این جی اوز نے مقامی ڈاکٹروں، انجنیروں یا دوسرے لوگوں کو ملازمت دی۔ عموماً باہر سے افراد لانے کو ترجیح دی۔ اقوام متحدہ نے بیرونی این جی اوز کو لاکھوں دیے جب کہ مقامی این جی اوز کو کام چلانا بھی مشکل رہا۔

افریقہ کے انسانی مصائب سے صرف امریکی این جی اوز ہی فائدہ نہیں اٹھا رہے تھے، اطالوی، برطانوی، فرانسیسی، کینیڈین کوئی بھی پیچھے نہ تھا۔ صومالیہ میں اقتصادی اور ہنگامی امداد کے ڈھیر لگ گئے۔ ایک بیان کے مطابق صومالیہ کو امداد کا قبرستان بنا دیا گیا۔ ایک اطالوی صحافی کے بیان کے مطابق: "اطالوی سوشلسٹوں نے صومالیہ میں کروڑوں ڈالر فراہم کر دیے اور چند استثنائی صورتوں کے علاوہ سب فضول اور بے کار منصوبے تھے" (واشنگٹن پوسٹ، ۲۴ جنوری ۱۹۹۳)۔

۱۹۸۱ سے ۹۰ کے درمیان، ایک ارب ڈالر کے ۱۱۴ منصوبوں کے لیے اطالوی تعمیراتی اور انجنیرنگ کمپنیوں کو ٹھیکے دیے گئے جنھوں نے روم میں حکمرانوں کو رشوتیں دیں۔ صومالیہ کے سابق صدر سعید بارے

نے امداد سے اسلحہ خرید کر اپنے ہی عوام سے جنگ کی۔ اس کے بیٹے کرنل حسن محمد بارے نے جس کے ہاتھ میں امداد کی رقوم آتی تھیں، سوئٹزرلینڈ میں جایداد اور بنک بیلنس بنائے۔ صومالیہ میں ہر طرح کے مظالم اور آمریت کے باوجود اٹلی سعید بارے کی مکمل حمایت کرتا رہا۔ جب حزب اختلاف کے ایک ممبر نے اسمبلی میں کہا کہ اٹلی آمروں کی سرپرستی کر رہا ہے تو وزیر خارجہ نے کہا: "اگر ہم آمروں کا ساتھ چھوڑ دیں تو افریقہ میں کوئی ملک تعاون کرنے کے لیے نہ بچے گا"۔ جب ۱۹۹۱ میں صومالیہ میں بحران پیدا ہوا تو این جی اوز کا ہجوم صومالیہ میں امڈ آیا۔ کیوں؟ امدادی رقم موجود تھی اس لیے وہ آئے۔ حکومت کے لیے اس میں خوب فائدہ تھا۔ زیادہ این جی اوز کا مطلب موگا دیشو میں زیادہ صدر دفاتر اور شہر کے زیادہ تر اعلیٰ مکانات، سعید بارے کے رشتے داروں اور اعلیٰ سرکاری افسروں کے تھے۔ دوسرے شہروں میں بھی غیر معمولی کرایوں پر یہ مکانات حاصل کیے گئے۔

این جی اوز کا مفاد اس میں تھا کہ مصیبت زدگان کی تعداد زیادہ ہو۔ World Vision ‘Oxfam ‘Save the Children ‘CRS ‘CARE کو یو ایس ایڈ اور پی ایل ۴۸۰ سے ملنے والے عطیات کی رقومات کا تعین بچوں یا متاثرہ افراد کی تعداد پر ہوتا تھا۔ صومالی معاشرے کی ٹوٹ پھوٹ کی ذمے دار ۹۰ کے عشرے کے اوائل کی غیر معمولی غذائی امداد تھی۔ قحط افریقہ کے لیے نئی چیز نہیں۔ مقامی طور پر اس کا مقابلہ کیا ہی جاتا تھا۔ اب صومالیہ کا مکمل انحصار غذائی اشیاء کی درآمد پر ہو گیا۔ یہ انحصار ۳۳ فی صد سے بڑھ کر ۶۳ فی صد اور پھر اس سے بھی زیادہ ہو گیا۔ غذائی اجناس کی قیمتیں کم ہونے سے مقامی کاشتکاروں نے فصلیں کم کر دیں۔ مقامی لوگوں کے لیے بھی پناہ گزینوں کے مراکز کے سامنے قطار لگانا آسان تھا۔ ایک صومالی عبدالرحمٰن عثمان نے شاکی انداز میں کہا: "خوراک کے لیے امداد نے ہمارے سسٹم کو تباہ کر دیا۔ ہم کبھی بھی غذائی امداد کے محتاج نہ تھے لیکن ماضی میں ایک سسٹم تھا۔ دیہی لوگ شہروں میں آ کر قرض لیتے جو اچھے وقتوں پر ادا کر دیتے"۔

اصل ضرورت مندوں تک کتنی امداد پہنچتی تھی؟ ۱۹۹۴ میں Save the Children کے لیے دیے گئے ڈالروں میں سے فیلڈ میں کل ۱ء۴۵ ملین ڈالر پہنچے۔ اس کا نصف، دوسری تنظیموں کو دیا گیا جن کے اپنے تنخواہوں کے اور دیگر اخراجات تھے۔ اس طرح اصل کا بہت کم فی صد اصل مقصد کے لیے صرف ہوا جب کہ سب منصوبے بھی مفید اور مناسب نہیں تھے۔

افریقہ میں خاندانی نظام کی وسعت اور استحکام کی وجہ سے کوئی "یتیم" نہیں ہوتا۔ جس بچے کے اپنے والدین نہ ہوں اسے کوئی چچا، پھوپھی، کوئی تایا زاد، کوئی دور کا رشتے دار بطور سرپرست مل جاتا ہے لیکن ایک ... یتیموں کی تلاش میں پہنچ گیا۔ انھیں اجازت دی گئی کہ وہ جو یتیم پائیں لے جائیں۔

۳۰' ۴۰ یتیم جمع کیے گئے اور قبیلے کے بڑوں کے احتجاج کے باوجود انھیں ٹرک میں ڈال کر موگادیشو میں کسی یتیم خانے میں لے گئے۔

کچھ بھی کہا جائے' اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ صومالیہ میں بین الاقوامی برادری نے ۳ء۵ ارب ڈالر خرچ کیے لیکن کچھ بھی حاصل نہ کیا۔ روانڈا میں نومبر ۹۶ میں زائرے کے بحران سے قبل تک جس میں ۶ لاکھ ہوٹو واپس روانڈا پہنچ گئے' مہاجر کیمپوں پر روزانہ ایک ملین ڈالر خرچ ہو رہے تھے۔ اب تک ۹۰۰ ملین ڈالر خرچ ہو چکے ہیں لیکن نتیجہ؟

دراصل مسائل کا اصل حل یہ ہے کہ بحران کو پیدا ہونے سے روکا جائے نہ کہ بیٹھ کر انتظار کیا جائے کہ کب بحران پیدا ہو اور خیمے' کمبل اور بسکٹ لے کر دوڑ پڑیں۔ لیکن یہ حل خود افریقہ کے اندر سے آنا ہو گا۔ یورپ مارشل پلان کے بعد خود کفیل ہو گیا اسی طرح افریقہ میں بھی' اگر وہ اپنی خوراک خود پیدا کرے' کسی مدد کی ضرورت نہ ہو گی' جیسا کہ وہ ۵۰ کے عشرے میں کرتا تھا۔ لیکن خانہ جنگیوں' آمرانہ حکومتوں اور تباہ کن زرعی پالیسیوں نے افریقہ کی زراعت تباہ کر دی۔ خانہ جنگیاں اس لیے ہیں کہ افریقی آمر نہ تخت چھوڑتے ہیں نہ عوام کو اقتدار میں شریک کرتے ہیں۔ اگر افریقہ کے آمر' سیاسی اقتدار میں عوام کی شرکت گوارا کرتے' تو ان ملکوں کے عوام ان آفتوں سے بچ جاتے۔ ان ملکوں کی افواج نے خود اپنے ملکوں کو تاراج کیا۔ الجزائر' برونڈی' ایتھوپیا' گیمبیا' گنی' لائبیریا' نائجر' نائیجیریا' روانڈا' سیرالیون' صومالیہ' یوگنڈا' زائرے' ہر جگہ ایک ہی کہانی ہے۔ فوج نے قبضہ کیا' عوام کو بے دخل کیا' لوٹ مار کی اور ملک تباہ کر دیا۔ ایک تجویز یہ دی جاتی ہے کہ ان ملکوں سے فوج ختم کر دی جائے جیسے کاسٹاریکا میں کوئی فوج نہیں۔

ایک راستہ یہ بھی ہے کہ ان فوجی حکمرانوں کو مغرب سے مدد نہ ملے اور مغرب ان ممالک میں حقیقی جمہوری نظام سے اپنے مفادات وابستہ کرے۔ لیکن یہ ان ممالک کے عوام کا خواب اور تمنا ہو سکتی ہے' حقائق کی دنیا اور تاریخ کی کہانی کچھ دوسری ہی ہے۔ مغرب جمہوریت کا علم بردار ہے لیکن صرف اپنے لوگوں کے لیے۔

حیرت ہوتی ہے کہ پاکستان میں کسی جامعہ نے' تحقیقی ادارے نے' یا محب وطن سکالر نے امریکی اور دوسری غیر ملکی امداد اور قرضوں کے معاشی' دفاعی' تعلیمی' سیاسی اور اخلاقی صورت حال پر اثرات کا تحقیقی مطالعہ آج تک کیوں نہ کیا۔ کیا اس لیے کہ اس کے لیے امریکی امداد نہ ملی!

اسلامی بنک کاری : سہ طرفہ شراکت کا تصور

سید عبد الرحمٰن الکاف

اشارات (مئی ۹۷)، اسلامی بنک کاری: اکیسویں صدی کا چیلنج (جولائی ۹۷)، غیر سودی بنک کاری اور سودی بنک کاری میں تعاون (اگست ۹۷)، ان تینوں فکر افروز مضامین کو پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ آپ کی توجہ زیادہ تر مفلوک الحال یا ترقی پذیر ممالک اور ان کے اقتصادی اور مالی احوال پر مرکوز ہے۔ بار بار ان پر بیرونی قرضوں کے منفی اثرات کا ذکر کرتے ہیں مگر آپ "ترقی یافتہ" سرمایہ دارانہ معیشتوں کا ذکر سرسری طور پر کرتے ہیں۔ اسلامی بنک کاری: اکیسویں صدی کا چیلنج (ص ۵۰، جولائی ۹۷) میں آپ نے امریکی قومی قرض ۴ کھرب امریکی ڈالر بتایا ہے۔ اب یہ تقریباً ۵٫۲ کھرب امریکی ڈالر ہے۔ آپ نے اس پر واجب الادا سود کی مقدار اور اس کے بھیانک حالیہ اور مستقبل کے اثرات کی طرف اشارہ نہیں کیا درآں حالیکہ امریکی معیشت، سرمایہ دارانہ معیشت کی معراج ہے۔

اگر ہمیں اسلام کے اقتصادی اور مالی نظام کی برتری، اسلامی اصولوں کی روشنی میں ثابت کرنا ہے تو ہم کو سود اور سودی لین دین کی وجہ سے سرمایہ دارانہ نظام کے اعلیٰ ترین نمونے کی ناکامیوں اور تباہ کاریوں کو واضح کرنا ہوگا اور پھر اسلام کی طرف دعوت اقدام و عمل دینا ہوگی۔ جاہلی سودی نظام کی ناکامی کی بہترین مثال خود امریکی اقتصادی اور مالی نظام ہے۔ ہمارا کام ہے کہ ہم اس کا گہرا مطالعہ کریں اور اس کی ناکامیوں اور تباہ کاریوں کو کھول کھول کر بتائیں۔

۳۱ اگست ۱۹۹۵ کو امریکی قومی قرض کی مقدار تقریباً ۵ کھرب ڈالر تھی اور اس پر روزانہ ایک ارب ڈالر اور سالانہ ۳۶۵ ارب ڈالر سود لاگو ہوا کرتا تھا۔ گذشتہ سال امریکی قومی قرض کی حد ۴٫۲ کھرب سے بڑھا کر ۵٫۲ کھرب صرف اس لیے کی گئی کہ سود ادا کرنے کی سابقہ حد میں گنجایش باقی نہیں تھی۔ یہ زیادتی بھی کشاں کشاں اپنی انتہا کو پہنچ رہی ہے۔ اس سلسلے میں، میں نے دو مقالے انگریزی میں لکھے:

(1) U.S.A. and the unbearable burden of interest payment.

(2) International debt of U.S.A. — A question of creditibility.

اس کے ساتھ ساتھ دو مقالے عربی میں تازہ ترین معلومات پر مبنی لکھے جو ہفت روزہ "البلاغ" صنعا میں الحمدللہ شائع ہو چکے ہیں۔ یہ تمام مقالات جن میں ریڈینس دہلی (۲۳-۲۹ جون ۱۹۹۷) کا مقالہ زیر عنوان: Lessons on interest from wall street (ص ۱۵-۱۸) بھی شامل ہے، یہ ثابت کرتے ہیں کہ سود کی لعنت میں گھر کر اب خود امریکی، یورپین اور جاپانی اقتصادیات مکمل تباہی کے دہانوں پر پہنچ چکے ہیں۔ وال اسٹریٹ اور دیگر ممالک کے اسٹاک ایکسچینج میں جو آئے دن الٹ پلٹ اور اونچ نیچ ہو رہی ہے اور ابھی اگست میں وال اسٹریٹ اور خاص طور پر جنوب مشرقی ایشیا میں جو جنونی بحرانی کیفیت رونما ہو چکی ہے، وہ نتیجہ ہے براہ راست سودی کاروبار اور لین دین کا۔ دنیا ان بڑی بڑی اقتصادیات کی غیر یقینی صورت حال کے تحت ایک بڑے اور خطرناک مالی اور اقتصادی بحران کی طرف حرکت پذیر ہے۔

اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ روزانہ کے اقتصادی امور پر گہری بصیرت کے ساتھ تبصرہ کر کے یہ بتایا جائے کہ یہ بحران در بحران کی صورت حال جاہلی اقتصادی نظام اور خاص طور پر سودی لین دین کا انجام ہے۔ یہ جاہلی نظام پر براہ راست حملہ آور ہونے کا بہترین وسیلہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ متبادل غیر سودی حل اور اسکیموں کو پیش کرنا اور ان کو قابل عمل بنانا اور عملاً نافذ بھی کرنا ازحد اہم ہے۔ اس طرح یہ منفی اور مثبت کام بیک وقت انجام دینے چاہییں۔

دوسری بات یہ ہے کہ جہاں روایتی بنک کاری، سودی قرضہ جات پر اپنے کاروبار کو فروغ دینے کے باوجود اپنے قرضوں کی واپسی کی ہر طرح ضمانتیں طلب کرتی ہے اور واپسی قرض میں رائے مشورے کے ذریعے مدد بھی کرتی ہے، وہاں اسلامی بنک کاری کا فرض ہے کہ وہ قرض کاری credit extension کے اول سے آخر سارے مراحل کا بغائر نظر جائزہ لے اور اپنے امانت داروں (depositors) کے سرمایے اور خود بنک کے سرمایے کی زیادہ سے زیادہ حفاظت اور اضافے کی خاطر ایسے عملی اقدامات اختیار کرے کہ واپسی قرض کی نہ صرف مادی بلکہ غیرمادی ضمانت بھی پوری ہو جائے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی بنک کاری ایک سہ طرفہ عمل ہے اور روایتی بنک کاری کی طرح دو طرفہ عمل نہیں ہے۔ اسی حقیقت پر میں نے اپنی ان تجاویز میں زور دیا ہے جو میں نے اپنے کتابچہ: Organisation of the credit operations under the Islamic Banking System میں پیش کی ہیں۔ عموماً ہمارے مقالات محض کلام مکرر ہیں، عملی بنک کاری سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے، نہ ہی صحیح نظری بنیاد (Ideological Basis) پیش کرتے ہیں۔ اس کا سبب ان مقالہ نگار حضرات کا یک طرفہ علم ہے۔ ان میں سے کوئی جدید نظری اقتصادیات سے واقف ہے تو اس کی دین میں مجتہدانہ نظر نہیں ہے۔ رہے علما کرام تو وہ جدید مسائل سے واقف نہیں ہیں۔ اس پر مستزاد یہ حضرات بنک کاری کا عملی تجربہ بھی نہیں رکھتے ہیں اور نہ ان کو امریکن اور یورپین بنک کاری کی موجودہ صورت حال کا علم ہے۔

آپ نے لکھا ہے: "اسلامی بنکوں میں قرضوں کے نادہندگان کے ساتھ سختی سے نپٹا جائے کیونکہ یہ خیانت ہے اور اسلام کی نظر میں بہت بڑا جرم اور گناہ ہے۔ عمومی طور پر بنکوں کی رقوم کے سلسلے میں کسی قسم کے غبن کو سماجی جرم قرار دیا جائے" (ترجمان القرآن، ص ۵۶، جولائی ۹۷)۔

یہ بات بنک کے کارندوں اور قرض داروں کے اجتماع میں بطور وعظ تو مناسب ہے مگر عالم مال و اقتصاد میں وہ درج ذیل ٹھوس اقدامات کی طالب ہے:

۱- بنک میں ایک ایسا قابل اعتماد ادارہ قرض کاری اور معلومات قائم کیا جائے جو ایک طرف تو ساری قرض طلبی کی اسکیموں کے مالی، اقتصادی اور ادارتی پہلوؤں پر غور و فکر کر سکے اور دوسری طرف طالبان قرض کے شخصی، خاندانی، مالی اور مادی حیثیتوں اور ان کے پچھلے ریکارڈ پر صحیح صحیح معلومات خود ان سے اور دوسرے ذرائع سے مہیا کر کے ان کے مستحق قرض اور نامستحق قرض ہونے کا فیصلہ کر سکے۔ اس کے علاوہ ان کو زرکاری کی سرگرمیوں (investment activities) اور ان کے مختلف مراحل اور تقاضوں اور مختلف اختیارتی امور options پر پورا عبور حاصل ہونا چاہیے تاکہ وہ بنک کی عام مالی صورت حال اور اس کی نقدی حالت (liquidity position) کا خاص طور پر خیال کر کے قرضوں کو منظور کریں یا نامنظور کریں۔

اس کے علاوہ اس ادارے میں کام کرنے والوں کو ملک کی عام مالی اور اقتصادی صورت حال سے واقف ہونا اور ملکی اقتصاد کے بعض حصوں (sectors) پر گہری نظر رکھنا ازحد ضروری ہے۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر ان کو اس سہ طرفہ زرکاری میں، ہر شریک کے حصے فیصدی (٪) کے انداز میں طے کرنے اور ان پر سارے ہی مراحل میں نظر رکھنے اور ہر حالت کے لحاظ سے نئے نئے کنٹرول کے ڈھنگ سوچنے اور ان پر عمل پیرا ہونے اور عمل پیرا کرنے کی صلاحیت بھی ہونی چاہیے۔ خلاصہ کلام یہ کہ ان حضرات کو ہر معنی اور مفہوم میں مدیر قرض کاری (credit manager) ہونا چاہیے۔

اسلام پسند چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ حضرات کا کام ہے کہ وہ نہ صرف بنک کے اندرونی حسابات کی جانچ پڑتال کے اصول اور ضوابط ایجاد کریں اور ان کو عملاً برتیں اور ان کو آہستہ آہستہ زیادہ سے زیادہ مفید بنائیں بلکہ ان کو بنک اور طالبان قرض کے درمیان ہونے والے حسابی مسائل کے حل بھی دریافت کرنے چاہییں۔ اگر ہم شراکت کے تصور کے عملاً کامیاب ہونے کے واقعی متمنی ہیں۔ تو یہ کام ناگزیر ہیں۔ ان کی ضرورت شدت سے اس لیے محسوس نہیں کی جا رہی ہے کہ درحقیقت موجودہ اسلامی بنک، روایتی بنک کی طرح اور ان ہی کے طرز پر قرض کاری کر رہے ہیں۔ اگر سہ طرفہ شراکت کا تصور، جیسا کہ میں نے اپنے کتابچے میں واضح کیا ہے، عمل کی دنیا میں جگہ پائے تو ان دونوں کی ضرورت شدت سے محسوس کی جائے گی۔

رسائل و مسائل

خواتین اور جینز کا استعمال

میری خالہ کافی عرصے کے بعد امریکہ سے اپنے اہل خانہ کے ساتھ آئی ہیں۔ ان کی بیٹیاں جینز پہنتی ہیں' لیکن جب وہ گھر سے باہر نکلتی ہیں تو سارے کپڑے چادر سے چھپا کر نکلتی ہیں۔ سر کے بال تک چھپے ہوئے ہوتے ہیں' جوتیاں اور تھوڑی تھوڑی جینز نظر آ رہی ہوتی ہیں۔ میں نے بہت دفعہ اپنی کزن کو جینز پہننے سے منع کیا۔ لیکن وہ کہتی ہیں کہ جینز پہننا کوئی گناہ نہیں ہے۔ نہ یہ مردوں کی مشابہت ہے اور نہ کافروں کی۔ وہ یہ جواز پیش کرتی ہیں کہ آج پوری دنیا میں عورتیں پینٹ پہن رہی ہیں۔ امریکہ میں بھی مسلم عورتیں پہنتی ہیں۔ ایران' سعودی عرب' دبئی' ترکی اور خود پاکستان میں بھی عورتیں پہنتی ہیں۔ اب ہم اگر کسی لڑکی کو پینٹ پہنا ہوا دیکھیں تو ہم اسے کافر نہیں کہہ سکتے کیونکہ اب یہ لباس مسلمانوں میں بھی رواج پا چکا ہے۔ کافروں کی مشابہت میں یہ جب ہوتا جب اسے صرف کافر ہی پہنتے۔ اگر پینٹ چست نہ ہو' ڈھیلی ڈھالی ہو' شرٹ پینٹ کے اندر نہ ہو بلکہ باہر ہو' ڈھیلی ڈھالی ہو اور کم از کم رانوں تک ہو اور ستر نمایاں نہ ہو' تو پینٹ جائز ہے۔ دوسرے' یہ بات کہ یہ مردوں کی نقل ہے' تو یہ بھی ٹھیک نہیں ہے کیونکہ ہمارے ہاں جس طرح عورتوں اور مردوں کی شلواریں ایک جیسی ہوتی ہیں' اسی طرح سب جگہ پر پینٹ بھی مردوں اور عورتوں کی ایک جیسی ہیں۔ اگر کوئی لڑکی پینٹ کوٹ پہنے یا مردانہ قمیص شلوار پہنے' یا کوئی خاص مردوں کا لباس پہنے تو وہ مردوں کی نقل ہو گا اور اسی طرح کوئی عورت خاص کوئی کافر عورتوں کا لباس پہنے تو وہ کافروں سے مشابہت ہے۔ اگر آپ میرے سوال کا جواب دے دیں تو مجھے اور میری کزن کو مسئلے کا اسلامی حل مل جائے گا۔

شرعی احکام کا علم حاصل کرنا ایک اسلامی فریضہ ہے جس کا آپ نے عملی نمونہ پیش کیا ہے۔ ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ درپیش معاملے میں حکم شرعی معلوم کر کے اس پر عمل کرے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

لباس کے بارے میں اصولی ہدایات سورۃ الاعراف' آیت نمبر ۲۶' ۲۷' ۲۸' ۳۱' ۳۲ میں دی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک اصولی ہدایت یہ ہے کہ لباس تقویٰ کا ہو۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ "لباس التقوی" کے متعلق تحریر فرماتے ہیں: "...... انسان کے لیے لباس کا صرف ذریعہ ستر پوشی اور وسیلہ زینت و حفاظت ہونا

ہی کافی نہیں ہے، بلکہ فی الحقیقت اس معاملے میں جس بھلائی تک انسان کو پہنچنا چاہیے، وہ یہ ہے کہ اس کا لباس تقویٰ کا لباس ہو، یعنی پوری طرح ساتر بھی ہو، زینت میں بھی حد سے بڑھا ہوا یا آدمی کی حیثیت سے گرا ہوا نہ ہو، فخر و غرور اور تکبر و ریا کی شان لیے ہوئے بھی نہ ہو اور پھر ان ذہنی امراض کی نمایندگی بھی نہ کرتا ہو جن کی بنا پر مرد زنانہ پن اختیار کرتے ہیں، عورتیں مردانہ پن کی نمایش کرنے لگتی ہیں اور ایک قوم دوسری قوم کے مشابہ بننے کی کوشش کر کے خود اپنی ذلت کا اشتہار بن جاتی ہے۔" (**تفہیم القرآن**، ج ۲، ص ۲۰)

ایک قوم کا دوسری قوم کے مشابہ بننے سے یہی مراد نہیں ہے کہ ان کے شعار کو اپنائے بلکہ ان کے طور طریقوں، وضع قطع، تراش خراش کو اپنانا بھی ان کے مشابہ بننا ہے۔ پھر دوسری قوموں کے ساتھ مشابہت کے علاوہ مسلمانوں میں ایسے لوگ اور ایسے طبقات جو دوسروں کی تہذیب و روایات کو اپنائے ہوئے ہوں، ان کے رہن سہن، ان کے لباس کو پہنتے ہوں، ان کے ساتھ بھی مشابہت نہ ہو، بلکہ صلحا اور متقین جو اسلامی تہذیب و اقدار کو سینے سے لگائے ہوئے ہوں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام اور سلف صالحین، مردوں اور عورتوں کے لباس کی یاد تازہ کرتے ہوں، ان کی پیروی اور نقالی کرنے والے ہوں۔ ان کے ساتھ مشابہت کرنے والے اہل تقویٰ اور اسلامی اقدار و روایات کو اپنانے والوں کی شکل اختیار کریں گے تو اللہ تعالیٰ ظاہر کا اثر باطن پر بھی ڈال دے گا۔ تواضع اور انکساری کا لباس آدمی میں تواضع اور انکساری پیدا کرتا ہے اور تکبر و غرور کا لباس آدمی میں تکبر و غرور پیدا کرتا ہے۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ اس موضوع پر اس آیت کی تفسیر لکھتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں: "لباس تقویٰ کے لفظ سے اس طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے کہ ظاہری لباس کے ذریعے ستر پوشی اور زینت و تجمل سب کا اصل مقصد تقویٰ اور خوف خدا ہے جس کا ظہور اس کے لباس میں بھی اسی طرح ہونا چاہیے کہ اس میں پوری ستر پوشی ہو، کہ قابل شرم اعضا کا پورا پردہ ہو، وہ ننگے بھی نہ رہیں، اور لباس بدن پر ایسا چست بھی نہ ہو جس میں یہ اعضا شکل ننگے کے نظر آئیں۔ نیز اس لباس میں فخر و غرور کا انداز بھی نہ ہو بلکہ تواضع کے آثار ہوں، اسراف بے جا بھی نہ ہو، ضرورت کے موافق کپڑا استعمال کیا جائے۔ عورتوں کے لیے مردانہ اور مردوں کے لیے زنانہ لباس بھی نہ ہو، جو اللہ کے نزدیک مبغوض و مکروہ ہے۔ لباس میں کسی دوسری قوم کی نقالی بھی نہ ہو جو اپنی قوم و ملت سے غداری اور اعراض کی علامت ہے۔ اس کے ساتھ اخلاق و اعمال کی درستی بھی ہو، جو لباس کا اصل مقصد ہے۔ (**معارف القرآن**، ج ۳، ص ۵۳۶)

آپ نے جینز کی جو صورت تحریر کی ہے، وہ بے شک وہی ہو جو آپ نے لکھی ہے کہ ساتر ہو، اس میں مردوں کے ساتھ مشابہت نہ ہو، لیکن یہ ہمارے معاشرے کی نہیں، بلکہ مغربی معاشرے کی ایجاد اور

مغرب کا لباس ہے۔ آپ تو بے شک اسے اس طرح استعمال کریں گی جو ساتر ہو گی' لیکن اپنی اصل کے اعتبار سے تو یہ ساتر نہیں ہے بلکہ اصل میں یہ مغربی لباس کی نقالی ہے۔ اس کے بجائے آپ اسلامیت اور پاکستانیت کو پھیلائیں' پاک و ہند کے دینی گھرانوں کو پیش نظر رکھیں۔ آپ پاکستان اور عالم اسلام کی صالحات کی پیروی کریں۔ اس سے دینی اور اسلامی ذہنیت نشوونما پائے گی' آخرت کی فکر پیدا ہو گی اور نیک خواتین کی طرح آپ میں بھی نیکی کا جذبہ پیدا ہو گا۔

نیک لوگوں کا لباس نیکی اور برے لوگوں کا لباس برائی کی ذہنیت پیدا کرتا ہے۔ انسان کا لباس' انسان کی صحبت تو آدمی پر اثرانداز ہوتی ہی ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جانوروں کی صحبت سے بھی وہی اوصاف پیدا ہوتے ہیں جو جانوروں میں پائے جاتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ بکریوں والوں میں مسکنت اور تواضع پائی جاتی ہے اور فخر و غرور اونٹوں کی دموں کو پکڑ کر چلنے والوں میں پایا جاتا ہے۔ لباس دراصل ذہنی طور پر اہل لباس کی صحبت ہے اور اس پر وہی اثرات مرتب ہوتے ہیں جو صحبت پر مرتب ہوتے ہیں۔ اس لیے ہماری طرف سے آپ کی کزن سے گزارش ہو گی کہ وہ جینز کے استعمال کو ترک کر دیں۔ اس پر ان کو ان شاء اللہ فائدہ ہو گا۔

آپ کی کزن نے ایران' سعودی عرب اور پاکستان کے جن اونچے گھرانوں کی خواتین کا حوالہ دیا ہے کہ وہ بھی پینٹ پہنتی ہیں' تو اس بارے میں عرض ہے کہ یہ وہ خواتین ہیں جو مغربی تہذیب کی نقالی کرتی ہیں اس لیے آپ ان سے کہہ دیجیے کہ ان کی نقالی کو چھوڑ دیجیے۔ ان کے بجائے دنیا کے اسلامی گھرانوں کی خواتین کو اپنے لیے نمونہ بنائیں جو مغربی تہذیب سے متاثر اور اس کی دلدادہ نہیں۔ وہ مغربی تہذیب کو باعث عزت و فخر سمجھنے کے بجائے اسلامی تہذیب و روایات کی قدر کرتی ہیں اور اس میں شرف و وقار سمجھتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق سے نوازے۔ (مولانا عبدالمالک)

امت کی بے حسی

ایک وقت امت مسلمہ پر ایسا تھا کہ وہ اپنوں ہی کی نہیں بلکہ اگر کسی غیر مسلم ملک میں کسی غیر مسلم نے بھی ان کو مدد کے لیے پکارا اور کہیں پر ظلم ہوا تو مسلمان مظلوموں کی امداد و نجات کے لیے پہنچ جاتے تھے۔ آج معاملہ برعکس ہے۔ امت مسلمہ پر جگہ جگہ ظلم ڈھائے جا رہے ہیں لیکن پوری امت خاموش نظر آتی ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

آپ نے جس بنیادی مرض complaseency' لاتعلقی' اپنی ذات میں گم ہو جانا' ارد گرد کے مسائل سے اپنے آپ کو لاعلم کر لینے کی طرف متوجہ کیا ہے' وہ دور جدید کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ آپ کا مشاہدہ کسی

حد تک درست ہے کہ آج بہت سے مسائل و معاملات میں مسلمانوں سے زیادہ غیر مسلم دلچسپی اور ردعمل کا اظہار کرتے ہیں۔ میں چاہوں گا کہ اس مسئلے کے تین بنیادی پہلوؤں کو اختصار کے ساتھ آپ کے سامنے رکھ دیا جائے۔

پہلی بات یہ کہ کیا حقیقت واقعہ کے طور پر یہ کہنا درست ہے کہ امت مسلمہ مظلوموں کی پکار پر لبیک کہنے میں دوسروں سے پیچھے ہے حتیٰ کہ جب خود مسلمان ظلم کا نشانہ بنتے ہیں تب بھی امت مسلمہ خاموش رہتی ہے؟ میرے خیال میں ابھی تک امت مسلمہ بحیثیت امت کے اتنی مردہ نہیں ہوئی ہے' ہاں جو حضرات امت مسلمہ پر سوار ہو کر بیٹھ گئے ہیں' ان کے مردہ ہونے کے بارے میں شاید ہی دو آرا پائی جائیں۔ آج بھی اگر کشمیر' فلسطین' بوسنیا' چیچنیا' برما' جنوبی فلپائن' آذربائیجان غرض کسی مقام پر امت مسلمہ کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے تو امت مسلمہ چاہے' وہ امریکہ میں ہو' پاکستان میں ہو' مشرق وسطیٰ میں ہو' مسلمانوں پر ظلم کے خلاف آواز اٹھاتی ہے۔ ہمارا ماضی کا نہیں آج کا مشاہدہ ہے کہ جہاد افغانستان میں امریکہ' شمالی افریقہ' مشرق وسطیٰ' پاکستان ہر ہر مقام سے نوجوانوں نے' جو امت مسلمہ کے صحیح نمایندے کہے جا سکتے ہیں' اپنے بھائیوں' بہنوں' بیٹیوں اور ماؤں کی پکار پر ظالم کے خلاف جہاد میں حصہ لیا اور اپنی حکومتوں کی خاموشی کی کوئی پرواہ نہ کی۔ گویا امت مسلمہ کی مٹی تھوڑی نہیں اچھی خاصی نم ہے اور ہمارا یہ سمجھنا درست نہیں کہ امت مسلمہ مردہ ہو چکی ہے۔

یہ درست ہے کہ امت کا ایک طبقہ جو اتفاق سے صاحب اقتدار بھی ہے' ذہنی اور مادی طور پر مغرب کے آقاؤں کا اتنا غلام بن چکا ہے کہ جب تک انھیں اپنے اپنے ان آقاؤں کی طرف سے سرکاری زبان میں "این او سی" نہیں مل جاتا' وہ امت کے کسی مسئلے پر زبان تک ہلانا مصلحت کے خلاف سمجھتے ہیں۔ اس طبقے کی کوشش ہمیشہ یہی رہی ہے اور رہے گی کہ وہ امت مسلمہ کے مسائل کو مغرب کی نگاہ سے دیکھے اور مغرب کے تجزیے اور ترجیح کو اپنے فیصلوں اور حکمت عملی کی بنیاد بنائے۔

اس قسم کے افراد یہ بھی چاہتے ہیں کہ امت مسلمہ آج کی لہو الحدیث میں ایسی الجھ جائے کہ اس کا کام صرف ریڈیو اور ٹی وی دیکھنا اور ابلاغ عامہ کے ذرائع میں سے صرف ڈش کو اپنا قبلہ بنا لینا ہو۔ یہ افراد عموماً یہ سمجھتے ہیں کہ وہ دنیا میں صرف اسی سیر و تفریح کے لیے آئے ہیں' باقی تمام کام' مسائل کا حل کرنا' یو این او اور او آئی سی جیسی کاغذی تنظیموں کا کام ہے۔ یہ ان کی ذمہ داری نہیں ہے۔ وہ بعض اوقات چند اسلامی ممالک کی طرف بھی رہنمائی کی نظر سے دیکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ ممالک ان کی طرف سے مسائل کو حل کرا دیں اور بغیر کسی قربانی' محنت' اور تکلیف کے ان کے سارے مسائل و مشکلات حل ہو جائیں۔ شاید ایسے ہی افرادؒ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ دن میں خواب دیکھتے ہیں۔

دوسری بات جو اس سے زیادہ سنگین اور میری نگاہ میں زیادہ توجہ طلب ہے، وہ نفسیات ہے جو امت کے بعض حضرات نے اپنے اوپر مسلط کر لی ہے، یعنی چاہے مسئلہ مسلمانوں پر ظلم کا ہو یا غیر مسلموں پر، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہر معاملے میں ڈور ہلانے والے بعض مخصوص ممالک ہیں۔ کسی مسئلے کا حل ان کی شراکت اور ان کی منظوری کے بغیر نہیں ہو گا۔ اس لیے امت مسلمہ کے مسائل و مفادات کا تحفظ بھی وہی ممالک کر سکیں گے۔ زیادہ واضح طور پر، ان کی نگاہ میں امریکہ کو آمادہ کیے بغیر نہ مسئلہ کشمیر طے ہو سکتا ہے نہ کسی مسلمان ملک میں اس کی اپنی پارلیمنٹ اور اس کے اپنے عوام اپنے وزیراعظم کا انتخاب کر سکتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ امریکہ کی مرضی کے بغیر وزرائے اعظم، سربراہان فوج، غرض کسی بھی ذمہ دار کا انتخاب یا تقرر نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک انتہائی حساس نفسیاتی مرض ہے جس میں ایک مریض مکمل طور پر اپنی قوت کارکردگی کو کسی بیرونی اور موہوم ہستی کے تابع کر دیتا ہے اور اپنی تمام کمزوری، نااہلی، سستی، لاپرواہی اور عدم صلاحیت کو دوسرے کے کھاتے میں ڈال دیتا ہے۔ یہ ایک فرار کی شکل بھی ہے کہ اپنی عدم کارکردگی کو دوسرے کی سازش اور چال کے پردے میں چھپا لیا جائے۔ اس مرض کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ نقادانہ معروضیت کے ساتھ لیا جانا چاہیے تاکہ امت مسلمہ کے اس حصے کو اس مرض سے نکالا جا سکے جو کم ہونے کے باوجود ہمارے لیے اہمیت رکھتا ہے۔

تیسری بات اس سلسلے میں یہ ہے کہ مسلمانوں کو جس بنا پر امت کہا گیا، قرار دیا گیا، وہ ان کا نسب، خون، رنگ، زبان یا علاقائی تعلق نہیں ہے۔ یہ صرف اور صرف ایک بنیاد ہے یعنی امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔ قرآن پاک نے معروف کی اصطلاح کو اس حق، عدل، صدق اور بر کے لیے استعمال کیا ہے جو مطلق ہو اور اضافی نہ ہو۔ ایسے ہی منکر کی اصطلاح کو ضلالہ، ظلم، کفر، فحش، کذب وغیرہ کے لیے استعمال کیا ہے اور یہ بھی مطلق معنی میں ہے۔ گویا یہ افراد کے تعلق سے تبدیل نہیں ہوتا۔ ظلم ایک مسلمان پر ہو رہا ہو یا ایک غیر مسلم پر، وہ ظلم ہی رہتا ہے اور جس طرح امت مسلمہ کی ذمہ داری ایک جسد واحد ہونے کی بنا پر اپنے مسلمان بھائی کو ظلم سے نجات دلانا ہے (انصر اخاکم ظالمًا او مظلومًا) ایسے ہی امت مسلمہ کی ذمہ داری ایک غیر مسلم کو بھی ظلم سے نجات دلانے کی ہے۔ اِعۡدِلُوۡا هُوَ اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰى کی شان نزول میں یہ ہے کہ مشرک اور کافر کے معاملے میں بھی شہادت حق دی جائے۔ یہ اضافی معاملہ نہیں ہے بلکہ مطلق معاملہ ہے۔ گویا امت مسلمہ کے لیے ضروری ہے کہ جہاں کہیں بھی ظلم ہو رہا ہو، وہ اس پر ایک واضح موقف اختیار کرے جو مداہنت پر نہیں، حق پر مبنی ہو۔ یہاں یہ بات بھی واضح طور پر سمجھ لیں کہ خود یہ طرز عمل بھی کافی نہیں ہے کہ امت کے تمام مسائل کے حل کرنے کی ذمہ داری ان برسراقتدار افراد پر ڈال دی جائے جو خود امت کے نمایندے نہیں کہے جا سکتے۔ مسائل کا حل، مسلمانوں کی امداد، مظلوموں کو ظلم سے نجات دلانا،

محض حکومتوں کی ذمہ داری نہیں ہے۔ اس میں امت مسلمہ کا ہر فرد اور بالخصوص تحریکات اصلاح کی بڑی مسئولیت اور جواب دہی ہے۔ ہم اتنے کمزور اور بے بس بھی نہیں ہیں جتنا ہم نے اپنے آپ کو نفسیاتی طور پر بنا لیا ہے۔ میں امت مسلمہ کی طرف سے بہت زیادہ پرامید ہوں اور سمجھتا ہوں کہ اس میں آج بھی وہ صلاحیت ہے کہ عالمی طور پر اپنے اصلاحی کردار کو ادا کر سکے اور تاریخ دانی سے آگے نکل کر تاریخ سازی کا کام سرانجام دے۔ (ڈاکٹر انیس احمد)

کتاب نما

Muslim Resistance to the Tsar: Shamil and the Conquest of Chechnia and Daghestan (زار کے خلاف مسلم مزاحمت: شامل اور فتح شیشان و داغستان)' موشے گیمر۔ ناشر: فرینک کاس کمپنی' لندن۔ صفحات: ۴۵۲۔ قیمت: درج نہیں۔

امام شامل کون تھے؟ انھوں نے قفقازی مسلمانوں کی تاریخ میں کیا کارہاے نمایاں سرانجام دیے جن کی یادیں آج بھی اہل قفقاز کا لہو گرما دیتی ہیں؟ بلاشبہ ان کی شخصیت کے بارے میں چند کتب موجود ہیں لیکن ان سے' اس ہمہ گیر شخصیت کا پیکر نہیں ابھرتا جو زار شاہی روس کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتا رہا۔ جس سے عزم اور حوصلہ مندی کی سیکڑوں داستانیں وابستہ ہیں۔ موشے گیمر کی (زیر نظر) کتاب اپنے موضوع سے پورا پورا انصاف کرتی دکھائی دیتی ہے۔

امام شامل ۱۷۹۶ میں پیدا ہوئے۔ وہ بچپن میں--- کمزور اور لاغر تھے' (مگر پھر) نہ صرف ان کی صحت بہتر ہوئی بلکہ ان کا قد چھ فٹ سے زیادہ لمبا ہو گیا۔ ان کے ہاتھ پاؤں حد درجہ مضبوط اور سینہ کشادہ ہو گیا--- وہ اپنے وقت کے بہترین تلوار زن اور گھڑسوار مشہور ہوئے اور پھر اللہ تعالیٰ نے ان سے وہ شان دار کام لیا جس کے لیے ان کی ولادت مقصود تھی۔ وہ مسلسل ۲۵ سال تک زار روس کے خلاف انتہائی ناموافق حالات میں برسرپیکار رہے۔ ان کی ذات میں صوفی و مجاہد کا دلآویز امتزاج تھا جس کی وجہ سے وہ بیک وقت دلوں اور زمین پر حکمرانی کرتے تھے۔

لیکن اتنا عظیم الشان انسان آج تک تاریخ کے دبیز پردوں میں ملفوف رہا۔ یہاں تک کہ موشے گیمر (جو کہ یہودی نژاد ہیں) کی تحقیقی کاوشوں نے انھیں مسلمانان عالم سے پوری طرح روشناس کرا دیا۔ ۱۸۳۴ میں جب امام شامل' تیسرے امام منتخب ہوئے' عالم اسلام سیاسی طور پر زوال کا شکار تھا۔ ایک طرف عثمانیوں اور قاچاریوں نے روسیوں سے شکست تسلیم کر لی تھی اور دوسری طرف قفقاز میں روسیوں نے اقوشہ' ترغو' منچتولی اور خونذاخ پر قبضہ کر لیا تھا۔ تیسری طرف خود قفقاز کے آوار حکمران روسیوں سے معاہدے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔

باوجودیکہ امام شامل اپنے عہد کی مقبول ترین شخصیت تھے مگر وہ اقتدار قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ جب امامت انھیں پیش کی گئی تو انھوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر حاضرین مجلس رونے لگے۔ وہ مسلمانان داغستان کی ضرورت تھے، اقتدار ان کی ضرورت نہ تھی اور یہی وہ بنیادی نکتہ تھا جس نے آگے چل کر ایک عظیم داستان حریت رقم کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ ان کے سامنے ترجیحات کی ایک مختصر فہرست تھی۔ شریعت کا نفاذ ان کی اولین ترجیح تھی۔ کیونکہ ان کے نزدیک اس پر عمل میں ہی مسلمانوں کی قوت کا راز تھا۔

دوم: چونکہ داغستان کا علاقہ متعدد ولایتوں پر مشتمل تھا اس لیے یہ ضروری تھا کہ روس کے خلاف ایک موثر مزاحمتی قوت کی تعمیر و تشکیل سے قبل ان ولایتوں کو اتحاد کی لڑی میں پرو دیا جائے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان باہمی اختلافات کا شکار ہو کر اپنی قوت کمزور کر بیٹھیں۔ نہ ہی وہ روس کو یہ تاثر دینا چاہتے تھے کہ وہ اپنے زیر تسلط رقبے کو وسعت دے کر روسیوں کے لیے خطرہ بن سکتے ہیں۔ چنانچہ شروع میں انھوں نے دو طرفہ حکمت عملی اختیار کی۔ ایک طرف روسیوں کی طرف تعاون کا ہاتھ بڑھایا۔ دوسری طرف مسلمان حکمرانوں کو یہ تاثر دیا کہ روسی ان کی پشت پر ہیں۔ یہ اس لیے ضروری تھا کہ انھیں کمزور سمجھ کر کہیں قفقازی ولایتوں کے مسلمان حکمران ان پر حملہ نہ کر بیٹھیں اور اس طرح روسیوں کے خلاف اس مجوزہ عظیم اتحاد کو جو کہ امام شامل کے ذہن میں تھا، ابتدا ہی میں حادثے سے دوچار نہ کر دیں۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے مسلمان حکمرانوں کو شریعت کے نفاذ کے لیے متحرک کرنا شروع کیا، تاکہ عوام الناس کی اخلاقی حالت کو اسلام کے مطلوبہ معیار پر لایا جاسکے۔

یہ اسی جذبہ و سوز دروں کا اعجاز تھا کہ خود روسی یہ تسلیم کرتے تھے کہ امام شامل نے قفقازی مسلمانوں کا اخلاق بلند و برتر کر دیا تھا۔ چونکہ وہ صاحب شریعت تھے، ان کی کوشش ہوتی تھی کہ ان کا ذاتی کردار کسی طور پر بھی باعث ملامت نہ بنے۔ انصاف ان کا طرہ امتیاز تھا اور ان کی اسلامی ریاست اسلام کے نظام عدل اجتماعی کا عملی نمونہ تھی۔ یہاں تک کہ اقلیتیں بھی ان کے جذبہ ترحم سے فیض یاب ہوتی تھیں۔ اس معاملے میں وہ فی الواقع سچے کثرت پسند (pluralistic) تھے۔ عوام خواہ عیسائی ہوں یا یہودی، انھیں حق تھا کہ وہ اپنے مذہب کے مطابق اپنی زندگی بسر کریں۔ ان کے ۲۵ سالہ دور حکمرانی میں ایک بھی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا کہ انھوں نے کسی کو زبردستی مسلمان کیا ہو۔ حالانکہ ان کے پاس روسی قیدی بھی تھے اور ایسے لوگ بھی تھے جو بھاگ کر ان کی پناہ میں آگئے تھے۔ وہ امیر المومنین تھے، عوام میں سے تھے اور عوام میں ہی رہتے تھے۔ لوگوں کی شکایات سننا اور ان شکایات کو رفع کرنا ان کی انتظامیہ کی اولین ترجیح تھی۔ وہ مقدمات کے فیصلے سرعت کے ساتھ کرتے تھے۔ عموماً موقعے پر ہی فیصلہ سنا دیا جاتا تھا۔ غلامی اور بیگار کے خلاف تھے۔

انسان کی عزت نفس کا خیال کرنے والے اور محتاجوں کے والی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ روس جیسی عظیم قوت کے مقابلے میں عوام کی تائید سے ۲۵ سال تک برسرپیکار رہے۔ وہ صلح جو انسان تھے لیکن روسیوں کے استعماری عزائم کی راہ میں سد سکندری بنے رہے۔ اس محاذ پر وہ کوئی کمزوری دکھانا پسند نہیں کرتے تھے۔ جب کچھ چیچن باشندوں نے ان کی والدہ محترمہ کے ذریعے روس کی بالادستی قبول کرنے کے لیے کہا تو وہ تین روز کے لیے گوشہ نشین ہو گئے۔ یہ ۱۸۴۳ کا واقعہ ہے۔ جب وہ باہر نکلے تو انھوں نے اعلان کیا کہ رسولؐ اللہ نے انھیں (خواب میں) حکم دیا ہے کہ جس نے روسیوں کے آگے سپر ڈالنے کے لیے سفارش کی ہے اسے ۱۰۰ درے مارے جائیں۔ چنانچہ سزا کی تعمیل کرائی گئی۔ پانچ دروں کے بعد جب ان کی والدہ محترمہ بے ہوش ہو گئیں تو امام شامل دونوں زانوؤں پر حالت دعا میں گر گئے اور بڑی دیر تک گریہ و زاری کرتے رہے۔ یہاں تک کہ انھیں حکم ملا کہ بقیہ سزا تم خود اٹھاؤ۔ چنانچہ ۹۵ درے اپنے جسم پر کھائے۔ اس کے بعد خوفزدہ چیچن حاضرین سے کہا کہ جاؤ اور اپنے لوگوں سے یہ واقعہ بیان کرو۔ ہمارے لیے روسیوں کے ہاتھوں شکست ناقابل قبول ہے۔

اتنا عظیم اور بے مثال شخص روسیوں کے خلاف کامیاب کیوں نہ ہوا؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔ امام اس ناکامی کے ذمہ دار قطعاً" نہ تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ روسیوں کے خلاف خلافت عثمانیہ کی قوت و جلال، قاچاریوں کا کوہ شکن عزم اور قفقازی عوام کا حوصلہ اور جذبہ جہاد اتحاد ثلاثہ کی شکل میں محاذ پر آ جائے۔ پندرہ سال تک وہ انتظار کرتے رہے، اپنی التجائیں بھیجتے رہے، لیکن عثمانیوں اور قاچاریوں نے قفقاز کے بطل جلیل کو اکیلا چھوڑ دیا۔ امام شامل تقریباً دس ماہ تک اپنی فوجوں کے ساتھ ان کا انتظار کرتے رہے۔ پھر وہ شدلی کے مقام پر روسیوں پر قہر بن کر ٹوٹے اور وادی الاذان کو روند ڈالا۔ لیکن انھیں اب تاریخ کے جبر کا ادراک ہو چکا تھا۔ عثمانی روسیوں سے شکست کھا چکے تھے۔ وہ مایوسی کی حالت میں اپنے مسکن کی طرف لوٹ گئے تھے۔ لوگوں نے معرکہ شدلی میں شامل کی افواج کی فتح کی خوشیاں منائیں، لیکن امام شامل غالباً اندر سے ٹوٹ چکے تھے۔ لوگوں کے خوش چہرے دیکھ کر انھوں نے کہا: "یہ وہ خوشی ہے جس کے بعد آلام ہی آلام ہیں"۔

امام شامل روسیوں اور انگریزوں کی مخاصمت سے بھی باخبر تھے۔ چنانچہ انھوں نے برطانیہ سے بھی روسیوں کے خلاف مدد کے حصول کے لیے رابطہ قائم کیا۔ لیکن روسیوں کے ساتھ دشمنی کے باوجود مسلمانوں کے بارے میں انگریزوں کا طرز عمل منفی ہی تھا۔

روسی اب اس پوزیشن میں تھے کہ امام شامل کی قیادت میں برپا قفقازی مسلمانوں کی تحریک مزاحمت کو بالآخر ختم کر دیں۔ ۱۹/ اگست ۱۸۵۹ تک وہ قفقاز کا تمام علاقہ اپنی تحویل میں لے چکے تھے۔ امام شامل نے

اپنے کنبے اور ۶۰۰ جانبازوں کے ساتھ غنیب کے پہاڑی سلسلے میں پڑاؤ ڈالا۔ ۵ اور ۶ ستمبر کی شب روسیوں نے رات کے اندھیرے میں حملہ کیا اور امام شامل کو جالیا۔ روسیوں کی خواہش تھی کہ انھیں ہر حال میں زندہ پکڑا جائے اور اس کے لیے وہ پورے گاؤں کو تاراج کرنے کے لیے تیار تھے۔ آج زار روس کی خواہش کی تکمیل کا دن تھا۔ امام شامل گرفتار کر لیے گئے۔ انھیں پیٹرز برگ لے جایا گیا۔ جہاں سے ۱۸۶۸ میں کسی نہ کسی طرح وہ حج کے لیے چلے گئے اور ۱۸۷۱ میں اپنے آقا و مولا کی سرزمین مدینہ میں خاک نشین ہو گئے۔

چھبیس ابواب پر مشتمل موشے گیمر کی کتاب میں ۱۳۷ صفحات تو صرف حواشی کے لیے مختص ہیں۔ ان کے مراجع میں کثیر حصہ روسی مصادر پر مشتمل ہے۔ معلومات اتنی جامع ہیں کہ تشنگی محسوس نہیں ہوتی۔ گیمر نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ نقشبندی اسلامی تحریک کے کوئی متشدد رویے نہیں تھے، اور یہ روسی استعمار کے ردعمل کے طور پر سامنے آئی تھی۔

امام شامل کی انتظامیہ کا ذکر کرتے ہوئے موشے گیمر لکھتا ہے کہ روسی اس امر کا اعتراف کرتے تھے کہ شامل کے ہسپتال اور طریقہ علاج اہل مغرب کے ہسپتالوں اور طریقہ علاج سے بدرجہا بہتر تھے۔ مسلمانوں کے اسباب شکست کا احاطہ کرتے ہوئے گیمر لکھتا ہے کہ روسیوں کے بے پناہ مالی وسائل، توپ خانہ اور ان کی طرف سے قفقاز میں قحط جیسے حالات پیدا کرنا مسلم تحریک مزاحمت کی ناکامی کا باعث بنے۔

قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ امام شامل کی تحریک مزاحمت کی ناکامی کے بعد قفقاز کے مسلمان تقریباً ڈیڑھ سو سال تک تاراج ہوتے رہے، اور سلامتی سے محروم رہے۔ چیچنیا کی حالیہ تاریخ شاید اسی تاریخ اغماض کی مظہر ہے۔ (مبصر: طارق جان۔ تلخیص: ادارہ، بہ شکریہ **وسطی ایشیا کے مسلمان**، اسلام آباد، مارچ، اپریل ۱۹۹۷)

یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ، حافظ احمد یار مرحوم۔ ناشر: ادارہ علوم اسلامیہ، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور۔ صفحات: ۱۴۷۔ قیمت: ۴۵ روپے۔

یہ ایک جامع علمی مقالہ ہے جو اپنے موضوع پر انفرادیت کا حامل ہے۔ اسے کئی برس پہلے حافظ احمد یار مرحوم نے ایم اے کے تحقیقی مقالے کے طور پر تحریر کیا تھا۔ پنجاب یونی ورسٹی کے شعبہ علوم اسلامیہ کے ۸ سو مقالوں میں سے، یہ مقالہ اشاعت کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ اس میں وراثت کے قرآنی اصولوں کی روشنی میں ثابت کیا گیا ہے کہ بیٹے کے ہوتے ہوئے یتیم پوتے کو وراثت نہیں مل سکتی۔ اس سلسلے میں قرآنی آیات، احادیث اور سنی اور شیعہ فقہی مسلک کے حوالوں کی مدد سے مدلل بحث کی گئی ہے۔

مقالہ نگار نے یتیم پوتے کی وراثت کے حامیوں کے دلائل کا تجزیہ کر کے ثابت کیا ہے کہ اس نظریے

کا تعلق قرآن پاک سے نہیں ہے۔ اس کا ماخذ ہندو مذہب ہے جس میں بیٹے اور پوتے وغیرہ صلبی اولاد کے علاوہ کوئی وارث نہیں ہوتا۔ پھر عقلی اور نقلی ولائل سے یتیم پوتے کی وراثت کو اسلام کے اصول وراثت کے ساتھ ناممکن العمل قرار دیتے ہوئے اس نظریے کے علم برداروں کی قلابازیوں کو بھی واضح کیا گیا ہے۔ پھر تعاون کے محتاج یتیم پوتے یا پوتیوں کے مسئلے کا قرآن پاک کی روشنی میں شرعی حل بھی بیان کیا گیا ہے۔ یتامٰی کے ساتھ رحمت و شفقت اور وصیت کا اصول پیش نظر رکھنا چاہیے۔ حکومت اور خاندان کی ذمہ داری ہے کہ ان کی کفالت کرے اور مورث کا حق ہے کہ اس کے بارے میں وصیت کرے۔ اس کا یہ حل نہیں ہے کہ اسلام کے نظام وراثت میں تبدیلی کر کے اسے بھی وارث بنا دیا جائے۔

ہمارے نزدیک یہ کتاب اپنے موضوع پر جامع ہے۔ انداز فی الواقع علمی، فقہی اور تحقیقی ہے۔ ادارہ علوم اسلامیہ، جامعہ پنجاب اس کی اشاعت پر خراج تحسین کا مستحق ہے۔ اس نوع کے مقالے اسی بات کی دلیل ہیں کہ اس ادارہ کے فضلا نے بڑے علمی کام سرانجام دیے ہیں۔ ادارے کو چاہیے کہ اس طرح کے دوسرے مقالے بھی جلد از جلد شائع کرے۔

اس مقالے سے علما، طلبا اور دینی جماعتیں خصوصی رہنمائی حاصل کر سکتی ہیں۔ اس کتاب کو تمام ممبران اسمبلی تک بھی پہنچانا چاہیے تاکہ ان میں اسلام سے ارتداد والے قانون کو ختم کرانے کا احساس پیدا ہو۔ (مولانا عبدالمالک)

تجلیاتِ سیرتؐ، حافظ محمد ثانی۔ ناشر: فضلی سنز لمیٹڈ، اردو بازار، کراچی۔ صفحات: ۴۵۱۔ قیمت: ۲۰۰ روپے۔

اگرچہ اسلام اور مسلمانوں کو ہر دور میں عیسائی، یہودی اور ہندو فضلا کے مبنی بر تعصب و جہالت اعتراضات کا سامنا کرنا پڑا ہے لیکن عصر حاضر میں یہ سلسلہ بوجوہ زیادہ شدت اختیار کر گیا ہے۔ تاہم ایسے غیر مسلم فضلا کی تعداد بھی کم نہیں جو محض اسلام کی تعلیمات اور حضورؐ کی سیرت طیبہ سے متاثر ہو کر حلقہ بگوش اسلام ہو گئے یا کم از کم انھوں نے علمی سطح پر اعتراف حقیقت کو شعار بنایا اور اسلام کے بارے میں تعصب آمیز روش کو خیرباد کہہ دیا۔ اس وقت جبکہ مسلم دشمن طاقتیں ہمیں ذہنی طور پر شکست خوردہ بنانے اور ہمارے حوصلوں کو پست کرنے کے لیے بڑے پیمانے پر پروپیگنڈے میں مصروف ہیں، ایسی کتابوں کی اشاعت کی اشد ضرورت ہے جو نومسلموں کے تاثرات اور سلیم الطبع غیر مسلم فضلا کی اسلام اور حضورؐ کے بارے میں مثبت آرا و تاثرات کو موثر طریقے سے پیش کریں۔ زیر نظر کتاب میں اس ضرورت کو بطریق احسن پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ فاضل مصنف نے مذاہب عالم کے عالموں، غیر مسلم سیرت نگاروں اور مصنفوں کی نظم و نثر کا ایسا انتخاب پیش کیا ہے جس سے اسلام کی حقانیت اور حضورؐ کی سیرت پاک کی

عظمت کا اثبات ہوتا ہے۔ کتاب میں جن اہم موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے ان کی تفصیل کچھ یوں ہے: دین اسلام کی حقانیت، صداقت اور مذاہب عالم پر فوقیت، اشاعت اسلام اور تلوار، اسلام اور تعدد ازواج، خاتم الانبیا اور تعدد ازواج، اسلام اور غلامی، جزیہ، عورت، اسلام اور مذاہب عالم: ایک تاریخی و تقابلی مطالعہ، غیر مسلم سیرت نگاروں اور مذاہب عالم کے دانش وروں کی کتب سیرت اور مضامین سے اقتباسات، ہندو اور سکھ شعرا کا نعتیہ کلام۔

اگرچہ اس طرح کی چھوٹی بڑی متعدد کتابیں پہلے بھی منظرعام پر آ چکی ہیں لیکن زیر تبصرہ کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں زیادہ سے زیادہ متنوع موضوعات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مطالب میں حسن ترتیب کے علاوہ کتاب کا صوری حسن بھی لائق داد ہے۔ رنگین سرورق اور عمدہ رنگین کاغذ، نیز خوب صورت طباعت کی بنا پر کتاب اس قابل ہے کہ احباب کو تحفے میں دی جائے۔ تمام اقتباسات کے اصل ماخذ کے حوالے دیے جاتے اور اس سلسلے میں یکساں طریقہ اختیار کیا جاتا تو بہتر تھا۔ اسی طرح کتابیات میں ہر کتاب کے مکمل کوائف درج کیے جاتے تو ان لوگوں کو سہولت حاصل ہوتی جو اصل کتابیں دیکھنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ (ڈاکٹر رحیم بخش شاہین)

السنن الواردۃ فی الفتن وغوائلھا والساعۃ واشراطھا، امام ابو عمرو عثمان بن سعید المقرئی الدانی۔
تحقیق: ڈاکٹر رضاء اللہ بن محمد ادریس مبارک پوری۔ ناشر: دارالعاصمۃ، ریاض (سعودی عرب)۔

آثار قیامت سے آگاہی اور واقفیت کی ایک مسلمان کی زندگی میں الگ اہمیت ہے۔ ان کی یاد دہانی دلوں کو نرم کرتی ہے، خوف خدا کو انسانی اعمال پر طاری کرتی ہے اور وقتاً فوقتاً رونما ہونے والے یہ آثار رسالت محمدیؐ پر ایمان کو مزید پختہ کر کے اس کی حقانیت کو واضح کر دیتے ہیں۔

اسی وجہ سے ائمہ حدیث نے آثار قیامت سے متعلق احادیث نبویؐ کو یکجا کرنے کا خصوصی اہتمام کیا۔ ان کتابوں میں سے ایک اہم کتاب امام ابو عمرو عثمان بن سعید المقرئی الدانی ۴۴۴ھ کی **السنن الواردۃ فی الفتن وغوائلھا والساعۃ واشراطھا** ہے جو کہ ڈاکٹر رضاء اللہ بن محمد ادریس مبارک پوری کی تحقیق و تدوین کے بعد تین جلدوں میں منظرعام پر آئی ہے۔ اس کتاب کی چند اہم خصوصیات یہ ہیں:

اول: مصنف کا دور، ائمہ حدیث کے سنہرے دور سے قریب تر ہے۔ اس کتاب میں مصنف کی روایت کردہ ۷۲۵ روایات خود ان کی سند کے ساتھ ہیں، اس لیے ان اسانید کی علم حدیث میں بڑی اہمیت ہے۔
دوم: مصنف نے اس کتاب میں اپنی سند کے ساتھ بعض ایسی اہم کتابوں سے روایات شامل کی ہیں جن کا گم شدہ کتابوں میں شمار ہوتا ہے، مثلاً امام علی بن معبد کی کتاب: **الطاعۃ والعصیان**، امام آجری کی کتاب: **الفتن**

' امام ابو الحسن القابسی کی کتاب: المنبہ للفطن من غوائل الفتن وغیرہ سوم: مصنف نے آثار قیامت سے متعلق روایات کو ۱۱۲ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ آثار قیامت پر اتنی تعداد میں ابواب مشکل ہی سے کسی دوسری کتاب میں ملیں گے۔ چہارم: محقق نے مختلف قلمی نسخوں سے موازنے اور احادیث کی تخریج میں خاص محنت کی ہے۔ کتاب کا مقدمہ بھی تحقیقی و معلوماتی ہے۔

مصنف کو اس تحقیقی مقالے پر ڈاکٹریٹ کی سند عطا کی گئی ہے۔ حدیث کی یہ اہم کتاب طباعت کے اعلیٰ معیار کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ اس ضمن میں ناشر کی مساعی لائق تحسین ہیں۔ (عبدالمتین منیری)

عالم عرب پر مشنری یلغار' ڈاکٹر مصطفےٰ خالدی و ڈاکٹر عمر فروخ' مترجم: محمد ظہیر الدین بھٹی۔ ناشر: اسلامک پبلی کیشنز' ۱۳' ای شاہ عالم مارکیٹ' لاہور۔ صفحات: ۳۰۶۔ قیمت: ۱۵۰ روپے۔

مسلمانوں کو جو بیرونی خطرات لاحق ہیں ان میں سے ایک عیسائی مبلغین کی یلغار ہے۔ عیسائیت کی موجودہ شکل کا' حضرت عیسیٰؑ کی حقیقی تعلیمات سے بہت کم تعلق ہے۔ اس کے باوجود اس کے پیروکاروں اور مبلغوں نے اس کی اشاعت کا خصوصی اہتمام کیا ہے۔ مسیحی مشن مغربی ممالک سے گہرے روابط رکھتے ہیں۔ ان سے بھاری مالی اعانت اور غیر معمولی سیاسی حمایت حاصل کرتے ہیں۔ صرف امریکہ میں دو سو سے زائد ادارے ہیں جو مسیحی مبلغین کو بر آمد کرتے ہیں۔ ان اداروں اور تنظیموں کو عیسائی ہی نہیں یہودی اور سیکولر ذہن کے امریکی بھی مالی مدد دیتے ہیں۔ صرف ۱۹۵۵ میں ان کو ۸۶ کروڑ روپے کی مالی امداد حاصل ہوئی۔ یہ مشنریاں تعلیمی پروگراموں کے علاوہ صحت اور دیگر فلاحی منصوبوں کی آڑ میں لوگوں میں اثر و نفوذ پیدا کرتی ہیں اور انھیں مغربی تہذیب کا دلدادہ بنانے اور مغربی استبداد و استعمار کا خادم بنانے کی کوشش کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں افریقہ اور ایشیا میں عیسائی مبلغین کی سرگرمیوں کا مطالعہ چشم کشا ثابت ہو سکتا ہے۔ خصوصاً برعظیم اپنے مخصوص حالات کی بنا پر عیسائیت کے لیے لقمہ تر ثابت ہوا ہے۔ انگریزی عہد میں مشنریوں کو جو اثر و رسوخ حاصل ہوا' اس میں آزادی کے بعد بھی کوئی کمی نہیں آئی۔ بلکہ قیام پاکستان کے بعد تو حکمرانوں اور عوام کی غفلت اور بیرونی تائید و اعانت کی بدولت عیسائیت کو پھلنے پھونے کا خوب موقع ملا۔ اقلیتوں کے ساتھ رواداری اسلامی معاشرے اور ریاست کا طرۂ امتیاز ہے۔ لیکن افسوس تو اس بات کا ہے کہ جتنی آزادی سے پاکستان میں عیسائیت کی تبلیغ ہو رہی ہے' اتنی آزادی سے شاید بھارت میں بھی نہیں ہوتی ہو گی۔ اس سلسلے میں عیسائی' مشن سکولوں' کالجوں' ہسپتالوں اور خط و کتابت کے ذریعے تدریس انجیل کے کورسوں کے علاوہ انسانی مجبوریوں سے خوب فائدہ اٹھاتے ہیں اور شب و روز اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سرگرم رہتے ہیں۔ اب کیفیت یہ ہے کہ اگر کسی عیسائی کو توہین رسالتؐ کے جرم میں ماخوذ کیا جائے تو یورپی ممالک اور

میڈیا اس کی حمایت میں سرگرم عمل ہو جاتے ہیں۔ اس امر کی ضرورت ہے کہ عوام و خواص کو عیسائی مبلغ اداروں کے اصل عزائم سے آگاہ کیا جائے۔

پاکستان کے بعض اہل علم اور علمی اداروں نے عیسائیت کی حقیقت اور عیسائی مشنوں کے اثرات کے مطالعے کی کوشش کی ہے لیکن یہ مطالعہ ناکافی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب کا موضوع اگرچہ "عالم عرب پر مشنری یلغار" ہے لیکن اس کی روشنی میں ہم پاکستان میں بھی عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں اور ان کے اثرات کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس میں مشنریوں کے حقیقی اغراض و مقاصد، علاج معالجہ، تعلیم، مشنری کالجوں اور یونی ورسٹیوں کے ذریعے عرب معاشرے میں نفوذ، مسلمانوں کو باہم لڑانے کے لیے منصوبہ سازی، مسلمان ملکوں میں بے جا مداخلت، قوم پرست خصوصاً علیحدگی پسند تحریکوں کی سرپرستی، معاشرتی خدمت کی آڑ میں مسلمان معاشرے اور اسلامی ثقافت کی تباہی کے عزائم، تبلیغ میں نسوانی عنصر کے ذریعے نوجوانوں میں بے راہ روی پیدا کرنے کے منصوبوں کی مثالوں سے نشان دہی کی گئی ہے۔ کتاب میں جو بات کہی گئی ہے، مستند حوالے سے کہی گئی ہے اور آخر میں مراجع کی فہرست بھی دے دی گئی ہے۔ جناب ظہیر الدین بھٹی نے مطالب کتاب کو عربی سے نہایت خوبی سے اردو میں منتقل کیا ہے۔ (ر۔ ب۔ ش)

ہمدرد صحت اور **نونہال نمبر**، ادارۂ ہمدرد، ناظم آباد کراچی۔ صفحات: ۱۱۲، اور ۲۷۲۔ قیمت: ۳۰ روپے اور ۲۵ روپے۔

جناب حکیم محمد سعید اور ان کے خصوصی معاون و رفیق کار جناب مسعود احمد برکاتی کی کاوشوں کا یہ پہلو قابل ستایش ہے کہ وہ اپنی نوعیت کے دو بلند پایہ اور معیاری رسالے شائع کر رہے ہیں۔ ایک "حفظ صحت اور سماجی بہبود" کا اور دوسرا "نونہالوں کی تعلیم و تربیت اور صحت و موت" کا ترجمان---- اگست میں اول الذکر کا "صحت نونہال نمبر" آیا ہے جو بچوں کی پیدائش، پرورش اور صحت سے متعلق عام فہم زبان میں معلوماتی مضامین پر مشتمل ہے۔ دوم: "نونہال" کا خصوصی نمبر (جس کے ساتھ ایک حسین کتاب کا تحفہ بھی ہے) حسب معمول دلچسپ، بامقصد اور تفریحی و معلوماتی مضامین، کہانیوں، واقعات، اقتباسات وغیرہ کا ایک عمدہ مجموعہ ہے---- یہ دونوں ہیں تو رسائل کے خاص نمبر مگر اپنی نوعیت میں مستقل کتابوں کا درجہ رکھتے ہیں۔ کتابت طباعت معیاری اور حسب ضرورت تصاویر سے مزین۔ (ادارہ)

مدیر کے نام

حبیب الرحمٰن قریشی ' کراچی

قومی دفاعی پالیسی (اکتوبر ۹۷) میں سورہ الحدید کی آیت ۱۰' (جس میں فتح سے قبل اور بعد کے انفاق کا ذکر ہے) کا حوالہ بھی آنا چاہیے تھا۔ زمانہ امن و جنگ میں وسائل حرب کی تیاری' فراہمی اور منصوبہ بندی کے لیے انفاق کی ہدایت امت مسلمہ کو ہمیشہ کے لیے دی گئی ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ اکثر اس آیت سے صرف نظر کر لیا جاتا ہے۔ پروفیسر عبدالجبار شاکر نے کلامی مسائل پر ڈاکٹر عبدالحق انصاری کے مضمون پر چلتا ہوا تبصرہ تو کر دیا (اکتوبر ۹۷)۔ کیوں نہ وہ خود مولانا مودودیؒ کے کسی ایک مسلک پر قلم اٹھائیں' مثلاً تعصب اور فرقہ بندی جس پر سید مودودیؒ نے اسلامی ریاست اور نفاذ قانون کے لیے سب سے زیادہ بولا اور لکھا ہے اور یہ آج کی ضرورت بھی ہے' یا جمہوریت اور یک جہتی قوم کے عنوان پر ان کے افکار کا مطالعہ اور تجزیہ کریں۔

پروفیسر ڈاکٹر احسان الحق ' جامعہ کراچی ' کراچی

پروفیسر عبدالقدیر سلیم نے "عالمی سرمایہ داری کا مستقبل" (اکتوبر ۹۷) میں ہمارے اردگرد کی زیر و زبر ہوتی دنیا کا نہایت چشم کشا تجزیہ پیش کیا ہے جس سے عالمی سرمایہ داری کی شکست و ریخت اور بالآخر ڈائنوسار کی طرح اس نظام کی نابودگی چشم تصور سے صاف نظر آتی ہے۔ البتہ تشنگی یہ رہ جاتی ہے کہ اس نظام کے ملبے پر کن قوتوں کو تعمیر نو کا موقع ملے گا؟ مضمون کے آخر میں ڈاکٹر صاحب نے اس نظام کے متبادل "اسلام کا معاشی نظام" کی طرف اشارہ کیا ہے مگر سرمایہ' تقنیات' سائنس' انصرام اور اطلاعاتی تقنیات کے میدان میں مسلمانوں کی زبوں حالی اور موجودہ پستی کے پیش نظر اس بات کا کتنا امکان ہے کہ یہ خلا مسلم امہ پر کرے؟ محترم خرم مرادؒ کا انتخاب "حب جاہ" بھی تربیت و تزکیہ نفس میں نہایت اہم اور قابل قدر ہے۔

سلیم منصور خالد ' گوجرانوالہ

عالمی سرمایہ داری کا مستقبل (اکتوبر ۹۷) میں سرمایہ داری نظام کا محاکمہ نہایت جامع اور مدلل انداز میں کیا گیا' تاہم صاحب مضمون نے کارل مارکس کا تذکرہ تین بار بطور "انسان دوست" کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ مارکس انسانی دوستی کا دعوے دار ضرور تھا مگر اس کے افکار و نظریات کے نتیجے میں برپا ہونے والے انقلاب سے انسانیت کو کڑوے کسیلے پھل ہی ملے۔

عبدالحفیظ احمد ' لاہور

قومی سلامتی اور دفاع (ستمبر ۹۷) میں دین دشمنوں اور وطن فروشوں کے عزائم کو دلائل کے ساتھ بے نقاب کیا گیا ہے۔ یقیناً یہ صاحب اشارات کے وسیع مطالعہ اور گہرے غوروفکر کا نتیجہ ہے۔ مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ نے تصوف کو شریعت پر فوقیت دی ہے (ستمبر ۹۷) حالانکہ قرآن و سنت میں تربیت و تزکیہ کے لیے سب کچھ موجود ہے--- Strategic کو اسٹرے تیجک کیوں لکھتے ہیں؟ اردو میں "ت" ہوتی ہے' عربی میں لکھنا ہو تو جواز ہے۔

محمد سلمان ' نیویارک

ترجمان میں ایسے مضامین شائع ہونے چاہییں جن سے ہم ہمہ وقت بدلتی صورت حال اور عصری تقاضوں سے آگاہ ہوتے رہیں۔ یہ رسالہ گھر میں بزرگوں کے علاوہ نوجوان اور خواتین سب پڑھتے ہیں۔ اس لیے اس کا خیال بھی رکھنا چاہیے۔ کوئی عمرہ یا حج پر جائے تو اسے ترجمان سے بلند تحریریں مطالعے کے لیے ملیں۔ میرے پسندیدہ حصے اشارات اور رسائل و مسائل ہیں۔ آپ کو ایک خوب صورت پرچہ نکالنے پر مبارک باد! ایک بات جان لیں: ہمارے دل آپ کے ساتھ ساتھ دھڑکتے ہیں!

حکیم نعیم الدین زبیری ' بیت الحکمتہ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ' کراچی

عبدالرحمٰن الکاف کا مراسلہ (اکتوبر ۹۷) پڑھا تو خیال ہوا کہ آپ کو اطلاع دوں کہ اشاریہ **ترجمان القرآن** کے بعد' **ترجمان القرآن** میں شائع ہونے والے تبصروں کو یکجا کرنے کا کام شروع کیا تھا جو آہستہ آہستہ تکمیل پذیر ہے۔ ترجمان کا اشاریہ جس ناقدری کا شکار رہا' اس نے ہمت توڑ دی' تاہم قدردانی اور قدر شناسی سے بے نیاز ہو کر یہ دوسرا کام کر رہا ہوں۔

معظم سعید ' سنجرپور (صادق آباد)

تزکیہ و تربیت کے موضوع پر جتنے بھی مضامین شائع ہوئے ہیں' بہت جامع اور دل نشین تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ موجودہ حالات کے اندر منزل کا تعین بھی بہت کٹھن ہو چکا ہے۔ لیکن **ترجمان القرآن** انفرادی اور اجتماعی تربیت کے لیے مکمل رہنمائی فراہم کر رہا ہے۔

محمد جمیل ابن الحسین ' اسلام آباد

ترجمان القرآن دور حاضر میں بہت اہم کام سرانجام دے رہا ہے۔ اسلامی قانون پر ڈاکٹر طفیل ہاشمی صاحب کے مضامین' عالمی اسلامی تحریکوں کی صورت حال اور ترجمان کے اداریوں نے بہت متاثر کیا' اللہ کرے ترجمان یونہی اپنی ذمہ داریاں نبھاتا رہے۔



دانتوں کی صفائی اور مسوڑھوں کی صحّت کے لیے انتہائی موثّر نباتاتی

مسواک ہمدرد پیلو ٹوتھ پیسٹ

اچھی صحت کا دارومدار صحت، ند دانتوں پر ہے۔ اگر دانت خراب ہوں یا عدم توجّہی کے باعث گر جائیں تو انسان دُنیا کی بہت سی نعمتوں اور لذّتوں سے لُطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ زمانۂ قدیم سے صحتِ دندان کے لیے انسان درختوں کی شاخیں بطور مسواک استعمال کرتا آیا ہے۔ ہمدرد نے تحقیق و تجربات کے بعد دارچینی، لونگ، الائچی اور صحتِ دہن کے لیے دیگر مفید نباتات کے اضافے کے ساتھ مسواک ٹوتھ پیسٹ" تیار کیا ہے جو دانتوں کو صاف اور سفید رکھنے کے ساتھ مسوڑھوں کو بھی مضبوط، صحت مند اور محفوظ رکھتا ہے۔

سارے گھر کا ٹوتھ پیسٹ

مسواک ہمدرد پیلو ٹوتھ پیسٹ

مسواک کے قدرتی خواص صحتِ دنداں کی مضبوط اَساس

ہمدرد

مدینۃ الحکمۃ تعلیم سائنس اور ثقافت کا عالمی منصوبہ

منشورات

۱۹۹۷ء کا اشاعتی پروگرام

ان شاء اللہ محترم خرم مراد کی درج ذیل تحریریں کتابی شکل میں پیش کی جائیں گی۔

۱- **حج وداع**: ترجمان میں شائع شدہ، جس پر انہوں نے نظر ثانی کی اور پروف خوانی بھی کر چکے تھے۔

۲- **اپنی تربیت کیسے کی جائے؟**: زیر تحریر کتاب، تین ابواب یکجا

۳- **کلام نبوی ﷺ کی صحبت میں**: ۱۹۹۶ء کے اسباق شامل کر کے مکمل

۴- **اشارات**: ملی قومی اور دینی مسائل کے حوالے سے تین مجموعے

۵- **رسائل و مسائل**: ترجمان القرآن میں شائع شدہ اہم مسائل کے جوابات

۶- **احمد کے نام**: بھارت کی قید سے نوجوان بیٹے کے نام ایمان کے تقاضوں سے آگاہ کرنے کے لیے سلسلہ وار خطوط

۷- **تصاویر قرآنی**: سید قطب کی التصویر الفنی فی القرآن کا جو حصہ نظر ثانی شدہ ترجمہ کے ساتھ شائع ہوا ہے

۸- **جنگی قیدی کے خطوط**: بھارتی قید سے لکھے گئے خطوط۔ (نیا ایڈیشن زیر طبع)

۹- **لمعات زندان**: ڈھاکہ میں قید کے دوران اہلیہ کے نام لکھے گئے خطوط۔ (نیا ایڈیشن زیر طبع)

۱۰- **یاد داشتیں**: آخری دنوں میں ابتدائے حیات سے ۱۹۷۰ء تک کے حالات کیسٹوں میں ریکارڈ کروائے تھے، انہیں تحریری شکل میں پیش کیا جائے گا۔

۱۱- **مکاتیب**: قابل اشاعت مکاتیب کی غیر معمولی تعداد ہے۔ مختلف عنوانات کے تحت شائع کیے جائیں گے۔

منشورات عن قریب دو مطبوعات پیش کر رہا ہے

☆ حاصل: مظفر بیگ، امین میں حادثے ہونے والے تیکھے ادیب

☆☆ عنایتیں کیا کیا: پروفیسر عنایت علی خان کے مجموعے عنایات، ازراہ عنایت اور بیاز و کلام، یکجا

منشورات

منصورہ، ملتان روڈ، لاہور 54570، فیکس: 042-7832194

حسین فاروق مودودی نے ملک عید محمد پرنٹرز سے چھپوا کر ۵- اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور سے شائع کیا

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اللہ مجھے ان لوگوں میں سے بنا دے جو نیکی کریں تو خوشی محسوس کریں اور برائی کر گزریں تو استغفار کریں"۔

(مشکوۃ المصابیح)

ہماری مطبوعات

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ترجمہ قرآن مجید مع مختصر حواشی اعلیٰ ایڈیشن 300 روپے
ترجمہ قرآن مجید مع مختصر حواشی ستا ایڈیشن 250 روپے
تفہیم القرآن جلد اول
(سورہ الفاتحہ تا سورہ الانعام) 225 روپے
تفہیم القرآن جلد دوم
(سورہ الاعراف تا سورہ بنی اسرائیل) 250 روپے
تفہیم القرآن جلد سوم
(سورہ الکہف تا سورہ الروم) 250 روپے
تفہیم القرآن جلد چہارم
(سورہ لقمان تا سورہ الاحقاف) 250 روپے
تفہیم القرآن جلد پنجم
(سورہ محمد تا سورہ الطلاق) 225 روپے
تفہیم القرآن جلد ششم
(سورہ التحریم تا سورہ الناس) 225 روپے
تفہیم القرآن ڈیلکس سیٹ 1800 روپے
تفہیم القرآن سپیشل سیٹ 1200 روپے
فہم القرآن 18 روپے
فہم القرآن (پارہ اول) 25 روپے
تفسیر سورۃ الفاتحہ و البقرہ 45 روپے
تفسیر سورۃ آل عمران 28 روپے
تفسیر سورۃ النساء 35 روپے
تفسیر سورۃ المائدہ 28 روپے
تفسیر سورۃ الاعراف 30 روپے
تفسیر سورۃ التوبہ 28 روپے
تفسیر سورۃ یونس 21 روپے
تفسیر سورۃ یوسف 13 روپے
تفسیر سورۃ المومنون 16/50 روپے
تفسیر سورۃ النحل 26 روپے
تفسیر سورۃ بنی اسرائیل 28 روپے
تفسیر سورۃ الانبیاء 18 روپے
تفسیر سورۃ الحج 28 روپے
تفسیر سورۃ النور 40 روپے
تفسیر سورۃ الفرقان 18 روپے
تفسیر سورۃ العنکبوت 18 روپے
تفسیر سورۃ لقمان 10 روپے
تفسیر سورۃ الاحزاب 30 روپے
تفسیر سورۃ یٰسین 12 روپے
تفسیر سورۃ الزمر 20 روپے
تفسیر سورۃ الفتح 18 روپے
تفسیر سورۃ الحجرات 18 روپے
تفسیر سورۃ الرحمٰن 12 روپے
تفسیر سورۃ الواقعہ 10 روپے
تفسیر سورۃ الحدید 21 روپے
تفسیر سورۃ المنافقون 10 روپے
تفسیر سورۃ التحریم 10 روپے
تفسیر تیسواں پارہ 60 روپے
سیرت سرورِ عالمؐ (جلد اول) 150 روپے
سیرت سرورِ عالمؐ (جلد دوم) 150 روپے
خطبات حصہ اول (حقیقت اسلام) 24 روپے
خطبات حصہ دوم (حقیقت صوم و صلوٰۃ) 15 روپے
خطبات حصہ سوم (حقیقت زکوٰۃ) 6 روپے
خطبات حصہ چہارم (حقیقت حج) 10/50 روپے
خطبات حصہ پنجم (حقیقت جہاد) 6 روپے
حقوق الزوجین 30 روپے
الجہاد فی الاسلام 125 روپے
خلافت و ملوکیت 90 روپے
سلاجقہ 28 روپے
دکن کی سیاسی تاریخ 28 روپے

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
مرتب: نعیم صدیقی۔ عبدالوکیل علوی

یہودیت قرآن کی روشنی میں 84 روپے
نصرانیت قرآن کی روشنی میں 75 روپے

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
مرتب: سید اسعد گیلانی

حکمت تبلیغ 80 روپے
دعوت و تنظیم 30 روپے

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
مرتب: اختر حجازی

قوموں کے عروج و زوال پر علمی
تحقیقات کے اثرات 36 روپے
استفسارات حصہ اول 75 روپے
استفسارات حصہ دوم 76 روپے
تفہیمات حصہ چہارم 60 روپے
خطبات یورپ مجلد 90 روپے
خطبات یورپ نمبر 27 روپے
دار الاسلام 12 روپے

عبدالکریم عابد

مولانا مودودی کے سیاسی افکار 24 روپے

سید قطب شہیدؒ

معرکہ اسلام اور سرمایہ داری 24 روپے

مولانا حیدر زمان صدیقیؒ

اسلامی نظریہ اجتماع 34 روپے
اسلام کا نظریہ جہاد 24 روپے
تعمیری انقلاب اور قرآنی اصول حکمت 24 روپے
عہد نبوت کے مسائل اور عصر حاضر 5 روپے

مولانا جلیل احسن ندویؒ

سفینہ نجات 75 روپے

سید اسعد گیلانی

رسول اکرمؐ کی حکمت انقلاب (مجلد) 120 روپے
مشاہدات حرمین 24 روپے
قرآن، رمضان اور محرم 21 روپے
اسلام اور مسلم خواتین 30 روپے
خطبات انبیاء 24 روپے
تحریک اسلامی کی پہلی کتاب 35 روپے
تحریک اسلامی کی دوسری کتاب 40 روپے
تحریک اسلامی کے مراحل 12 روپے
تحریک اسلامی کا تعارف [illegible] روپے
اسلام اور سوشلزم 40 روپے
دوش بدوش 46 روپے
اسلامی نظریہ ادب 30 روپے
امت مسلمہ سے خطاب 50 روپے

ام فاروق

رسول اکرمؐ 48 روپے

شبیر احمد منظر قدوسی

اقامت دین ناکام کہاں اور کیسے ہو؟ 6 روپے

اختر حجازی

انسانیت کی موجودہ مشکلات اور سیرت رسولؐ 13/50 روپے

ڈاکٹر محمد امین

عصر حاضر اور اسلام کا نظام قانون 60 روپے

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ

رحمٰن مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور فون:- 7236652-7234014 پوسٹ کوڈ 54000

U.P.L. 236
Phone : 7587916
7585590
Monthly **TARJUMAN-UL-QURAN** LAHORE.

